تدبّر

زیرِ نگرانی
مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات
ادارہ تدبّرِ قرآن وحدیث
لاہور۔ پاکستان

سلسلہ نمبر ۲۵ ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ جولائی ۱۹۸۸ء

تدبّر

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

تصوف کی حقیقت ——— خالد مسعود ۳

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۂ مائدہ (۵) ——— خالد مسعود ۱۰

تدبرِ حدیث

نمازوں کے اوقات (۳) ——— امین احسن اصلاحی / ماجد خاور ۱۸

افاداتِ فراہی

حکمتِ قرآن (۴)

حکمت کی جستجو ——— خالد مسعود ۲۵

مقالات

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل سے خطاب کی حکمت ——— خالد مسعود ۳۲

ظلم کی حقیقت ——— محبوب سبحانی ۳۸

مجلسِ ترتیب

- خالد مسعود (مدیر)
- عبداللہ غلام احمد
- ماجد خاور
- محبوب سبحانی

ناشر : اداره تدبر قرآن و حدیث
رحمان سٹریٹ ، مسلم کالونی ، سمن آباد ، لاہور
مطبع : المطبعة العربیة - لاھور
قیمت : ۵/= روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ ——— خالد مسعود

تصوّف کی حقیقت

علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم ملک کی ایک سیاسی شخصیت کے طور پہ پہچانے جاتے تھے لیکن ان کا یہ خاص علمی ذوق بھی تھا کہ وہ مختلف فرقوں کے بارے میں برابر مطالعہ کرتے رہتے اور پھر اپنے مطالعہ کا نچوڑ اعلیٰ تحقیقی کتابوں کی صورت میں پیش کرتے۔ ان کی تحقیق کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ہر فرقہ کی اپنی کتابوں پر اعتماد کیا اور ان کے اقتباس نقل کرنے میں کسی تساہل سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے بیشتر عربی زبان میں لکھا اور عربوں کو مختلف فرقوں سے خوب روشناس کرایا۔ اسی سلسلہ کی ایک کتاب "التصوف" بھی ہے۔ جسے ادارہ ترجمان السنۃ ۷۵/۴ شادمان لاہور نے شائع کیا ہے۔

تصوف ایک عالمگیر طرزِ فکر اور طرزِ عمل ہے جس کا وجود ہر مذہب میں پایا جاتا ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی براعظم سے ہو۔ جہاں تک مسلمان صوفیا کا تعلق ہے۔ وہ صرف ہمارے ملک کے مختلف حصوں ہی میں نہیں ہوتے بلکہ آپ جس اسلامی ملک میں چلے جائیں وہاں آپ کو خانقاہی سلسلے بھی ملیں گے، پیروں فقیروں سے بھی سابقہ پیش آئے گا، مزاروں پر لوگوں کا جمگھٹا بھی ہوگا اور عرسوں کے مواقع پر آپ صوفیوں کے طور طریقوں کا مشاہدہ بھی کریں گے۔ کہیں قوالیاں ہوں گی، کہیں رقص اور دھمال کا انتظام ہوگا اور چلہ کشیوں اور اوراد و وظائف کا تذکرہ تو آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ بڑے سے بڑے روشن ضمیر صوفی کی کتابیں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ وہ اسلام میں شریعت اور طریقت کی دو شاخیں مانتے ہیں۔ اول الذکر کو چھلکے سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس کا وارث علماء کو سمجھتے ہیں۔ طریقت کو اصل مغز مانتے ہیں اور اس کے اجارہ دار وہ خود ہیں۔ قرآن و سنت، کو ان کے

ہاں وہ اہمیت حاصل نہیں جو اہمیت ان کے اپنے سلسلے کے طریقوں کو حاصل ہے۔ صوفیاء کے ساتھ عوام الناس کو بڑی عقیدت ہے۔ ان کی ثقافتی سرگرمیوں کا بہت سا تعلق مزارات کے ساتھ ہے، اور وہ اسلام کی جس تعبیر سے واقف ہیں اس میں تصوف کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس لیے وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے، اسلام کی صحیح تعبیر اس سے قطعی مختلف ہے۔

علامہ صاحب نے اپنی کتاب میں یہ بتایا ہے کہ تصوف کب وجود میں آیا، اس کے بانی مبانی کون تھے اور اس کے افکار و نظریات اور طور طریقے کہاں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ ان کے نزدیک صوفی کا اطلاق سب سے پہلے جن اشخاص پر ہوا وہ جابر بن حیان، عبدک اور ابو ہاشم کوفی تھے۔ جابر اور ابو ہاشم دونوں کوفی شیعہ تھے۔ عبدک کا تعلق مصر سے تھا اور وہ بھی موروثی امامت کا قائل تھا۔ یہ تینوں اپنے عہد میں زندیق کہلاتے۔ ان کے سال وفات دوسری صدی ہجری کے نصف آخر اور تیسری صدی کے اوائل میں پڑتے ہیں۔ اس لیے اہل تحقیق کے نزدیک تصوف تیسری صدی میں روشناس ہوا ہے۔ صوفیاء خود اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ کے صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے دور میں صوفی اور تصوف کے الفاظ موجود نہ تھے۔ اس پاکیزہ دور میں لوگوں کو مسلم، مومن، زاہد، عابد، وغیرہ صفات سے پہچانا جاتا تھا جن کے مفہوم سے لوگ بخوبی واقف تھے۔

مسلم معاشرے میں تصوف کا آغاز کیسے ہوا؟ اس ذیل میں فاضل مصنف نے تین آراء بیان کی ہیں۔ خود صوفیاء کے نزدیک تصوف زہد کا دوسرا نام ہے جو ایک معروف اسلامی اخلاق ہے۔ اسی کی تربیت کے نظام کو تصوف کا نام دیا گیا۔ البتہ بعد میں اس میں اجنبی فلسفے بھی داخل ہو گئے۔ اس رائے کو ابن تیمیہ اور شوکانی نے بھی اختیار کیا ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ تصوف کا اسلام سے دور نزدیک کا کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح یہ نام اجنبی ہے اسی طرح اس کا مسلک بھی اسلام کے لیے اجنبی ہے۔ لہٰذا قرآن و سنت میں اس کی بنیادیں تلاش کرنا ایک بیکار کام ہے۔ اہل سنت کے بہت سے فقہاء و متکلمین اور مستشرقین کی اکثریت اسی رائے کی حامل ہے۔ تیسری رائے کے مطابق تصوف مختلف مذاہب کے افکار و نظریات کا ایک ملغوبہ ہے۔ اس میں جہاں اسلام کی بعض باتیں لی گئی

ہیں وہیں یہودیت، عیسائیت، مانویت، مزدکیت، مجوسیت، بدھ مت، جین مت، ہندو مت اور فلسفہ یونان سے بھی خیالات لیے گئے ہیں۔ اس رائے کو بعض صوفیاء نے خود بھی بیان کیا ہے۔ فاضل مصنف اسی آخری رائے کے حامل ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف میں خانقاہ کا تصور یہودیوں سے، رہبانیت کا تصور عیسائیوں سے، برہمنی نظام ہندوؤں سے، ترک دنیا کی تعلیم بدھ مت سے اور فکر مجوس اور یونانی فلاسفہ سے لی گئی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ان تصورات کو ملا کر تصوف کی داغ بیل ڈالی گئی۔

فاضل مصنف نے اپنی رائے کے حق میں دلائل کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ مثلاً ان کے نزدیک مشہور صوفی ابراہیم بن ادہم کے تخت حکومت سے فرار اور گوتم بدھ کے ترک حکومت میں گہری مشابہت ہے۔ صوفیوں کا مخصوص لباس اور ہیئت، گدائی راہبوں کی طرح ہے۔ ان کی لاہوت اور ناسوت کی اصطلاحیں عیسائیوں سے آئی ہیں اور دنیا سے دور بھاگنا، شادی کو جنجال سمجھنا اور اپنے اوپر خدا کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حرام کر لینا رہبانیت کا اثر ہے۔ صوفیاء میں اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرنا، فاقے کرنا، مراقبہ کرنا اور سانس روکنے کا عمل ہندو جوگیوں سے آیا ہے۔ جنید بغدادی کا قول ہے کہ ہم نے تصوف قیل و قال سے نہیں بلکہ فاقہ کشی، ترک دنیا اور مرغوبات سے اجتناب کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ سہل تستری کا قول ہے کہ ابدال پیٹ کو خالی رکھنے، راتیں جاگنے، خاموشی اختیار کرنے اور تنہا رہنے سے بنتے ہیں۔ جوگیوں کے اثر کے تحت بعض صوفی غاروں میں کھانے و پوشاک سے بے پروا رہتے رہے ہیں اور ان میں سے بعض مانگ کر کھانے کو نیکی سمجھتے رہے ہیں۔ مصنف کے نزدیک آپ شری شنکر اچاریہ کی ویدانت کی بحث پڑھیے اور پھر حلاج، ابن عربی اور جلال الدین رومی کے وحدت الوجود اور حلول کے فلسفہ کو پڑھیے تو کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔ اسی طرح شیخ احمد سرہندی کی وحدت الشہود کی تقریر اور اپنشد کے شارح رام نوج اچاریا کے خیالات میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ نروان حاصل کرنے کے لیے بدھوں کا گیان دھیان اور صوفیوں کی توجہ اور مراقبہ ایک ہی نوعیت کی چیزیں ہیں۔ معرفت، فیض، محبت اور اشراق کے فلسفے نو افلاطونیت کی پیداوار ہیں۔ اہل فارس نے تصوف کے پھیلانے میں جو سرگرمی دکھائی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اولین صوفیوں۔ ابراہیم بن ادہم، شقیق بلخی، بایزید بسطامی، یحییٰ بن معاذ رازی۔

سب کا تعلق اسی سرزمین سے ہے اور تصوف کا اہم مرکز خراسان رہا ہے جو اسلام سے قبل بھی مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے باہم ملنے کی جگہ تھی۔

امتِ مسلمہ کے اندر زہد اور تربیتِ اخلاق کے نام پر غیر اسلامی افکار اتنے منظم طریقے سے کس طرح داخل ہو گئے! اس بارے میں علامہ صاحب کا خیال یہ ہے کہ شیعہ مذہب کے پھیلاؤ کی راہ میں امت کے اندر پائی جانے والی عصبیت ایک رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ جس کے باعث شیعیت کا اثر محدود تھا۔ شیعوں نے تصوف کی آڑ میں اپنے نظریات پھیلائے اور مسلمانوں نے صوفیوں کی ظاہری نیکی کو دیکھتے اور ان کو اہل اللہ سمجھتے ہوئے ان پر اعتماد کیا۔ اس طرح جو مقصد شیعہ اپنی سیاسی تنظیم سے حاصل نہ کر سکتے تھے وہ انہوں نے تصوف کے ذریعے حاصل کیا۔ اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے مصنف نے بڑے مسکت دلائل فراہم کیے اور صوفیاء اور شیعہ مصنفین کے خیالات کا تقابل کر کے دکھایا ہے کہ تصوف شیعیت ہی کی ایک شاخ ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تجزیہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کے رائج کردہ اسلام اور شیعیت کے نظریات میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جس کا مشاہدہ ہم اپنے ملک میں کر سکتے ہیں۔

علامہ صاحب کی پہلی دلیل یہ ہے کہ تصوف کے سلسلوں کا آغاز، الا ماشاء اللہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوتا ہے جو شیعہ کے پہلے امام ہیں۔ صوفیہ کا دعویٰ ہے کہ تمام صحابہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ سب سے بڑے زاہد تھے اس لیے وہ اہل تصوف کے امام ہیں حقیقت یہ نہیں۔ مصنف نے بتایا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی سب سے زیادہ زاہدانہ تھی، ان کی وفات ہوئی تو کوئی دینار و درہم ترکہ میں نہ چھوڑا۔ ان کے کفن کے لیے ان کے مستعمل کپڑے ہی استعمال میں لائے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوتے تو ان کے لباس پر پیوند ہی پیوند نظر آتے تھے۔ سفر حج پر گئے تو خیمہ میسر نہ تھا۔ اپنی چادر کسی درخت پر پھیلا دیتے اور اس کے سائے میں آرام کرتے۔ مرتے وقت وصیت فرمائی کہ گھر کا سامان بیچ کر وہ مال بیت المال کو لوٹا دیا جائے جو بطور خلیفہ وہاں سے لیا گیا تھا۔ اگر یہ ناکافی ہو تو ان کے قبیلہ بنی عدی سے اپیل کی جائے کہ وہ اس میں امداد دیں۔ اس کے بالمقابل حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چار بیویاں، انیس (۱۹) ام ولد کنیزیں، چوبیس (۲۴) لڑکے لڑکیاں اور متعدد خدام چھوڑے جن کے پاس زمین کے وسیع قطعات تھے جن کی آمدنی سے وہ بسہولت

زندگی بسر کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد انہی کی نسل کے کئی افراد اہل تصوف کے شیخ بھی کہلائے اور شیعوں کے امام بھی۔ محمد باقر، جعفر صادق، موسیٰ کاظم اور علی رضا تک یہ سلسلہ پہنچتا ہے اس کے بعد تصوف کے اکابر معروف کرخی، سری سقطی، داؤد طائی اور جنید بغدادی آتے ہیں۔ معروف نومسلم تھے جو علی رضا کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ دوسرے ان کے دوست یا رشتہ دار تھے۔ شقیق بلخی موسیٰ کاظم کے اور بایزید بسطامی جعفر صادق کے شاگرد تھے۔ حسن بصری کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شاگرد بتایا جاتا ہے لیکن اہل تحقیق کے نزدیک ان کی ملاقات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں۔ پس تصوف کے سلسلوں کا آغاز جن لوگوں نے کیا وہ تمام شیعہ اماموں کے پروردہ لوگ تھے۔ لہٰذا اہل تصوف کے افکار میں شیعی معتقدات کا اثر نہایت نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً

(ا) شیعہ کے نزدیک اماموں کو وہ روحانی کمالات حاصل ہوتے ہیں جو کسی مقرب فرشتہ اور نبی کو بھی حاصل نہیں ہوتے۔ چنانچہ جعفر صادق کا قول نقل ہوا ہے کہ اگر میں موسیٰ و خضر کے ساتھ موجود ہوتا تو ان کو بتاتا کہ میں ان دونوں سے زیادہ علم رکھتا ہوں۔ اسی عقیدہ کو خمینی نے اپنی کتاب ولایت فقیہہ میں بدیں الفاظ بیان کیا ہے۔ "ہمارے مذہب کی ضروریات میں سے یہ بات ہے کہ کسی شخص کو اماموں کے معنوی و روحانی کمالات حاصل نہیں ہو سکتے حتیٰ کہ کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی ان کو نہیں پا سکتا۔ ہمارے ہاں یہ روایت موجود ہے کہ عالم کے وجود میں آنے سے قبل امام عرش کے سایہ میں بصورتِ نور موجود تھے"۔ یہی بات صوفیا کہتے ہیں ان کے نزدیک اولیاء کو وہ تمام خصوصیات حاصل ہوتی ہیں جو انبیاء کو حاصل ہیں۔ اولیاء ملائکہ کو دیکھتے اور ان سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ شیخ الجیلی نے دعویٰ کیا کہ انہیں معراج ہوئی انھوں نے سدرۃ المنتہیٰ دیکھی اور رب کی تجلیات کا مشاہدہ کیا۔ شیخ تاج الدین سے جب کچھ پوچھا جاتا تو کہتے ذرا صبر کرو، جبریل کو آ لینے دو۔ ابوالحسن خرقانی، ابن عربی اور کئی اور صوفیاء نے بھی اپنے سفرِ معراج کا ذکر کیا ہے۔

(ب) جس طرح شیعہ امام، غیب تک رسائی رکھتے ہیں اسی طرح صوفیاء کا دعویٰ ہے کہ جب حجاب دور ہو جاتے ہیں تو ہر وہ چیز روشن ہو جاتی ہے جو لوحِ محفوظ میں چھپی ہوتی

ہے۔ اور قطب کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ عرش، کرسی، آسمانوں، زمینوں اور تمام لوگوں کے نام و نسب، عمر اور اعمال تک سے واقف ہوتا ہے۔

(ج) شیعہ امام انبیاء کے مساوی ہیں بلکہ ان کو انبیاء پر فوقیت حاصل ہے۔ اسی طرح صوفیاء کا عقیدہ یہ ہے کہ اولیاء انبیاء پر فضیلت رکھتے ہیں۔ بایزید بسطامی کا قول ہے کہ ہم ان سمندروں میں کود گئے، انبیاء جن کے ساحلوں پر کھڑے رہ گئے۔ اور "اے گروہ انبیاء لقب تو تمہیں مل گیا لیکن عطا ہمیں وہ کچھ ہوا ہے جو تمہیں نہیں دیا گیا"۔ بسطامی کا یہ دعویٰ بھی نقل ہوا ہے کہ "اللہ کی قسم! میرا جھنڈا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے سے بڑا ہوگا۔ یہ نور کا ہوگا اور اس کے نیچے جن وانس ہوں گے جو سب کے سب نبی ہیں"۔ ابن عربی کا قول ہے کہ رسول کے پاس صرف ظاہری علم اور شریعت ہوتی ہے جبکہ ولی کے پاس علم شریعت و علم طریقت دونوں ہوتے ہیں۔ نبوت و رسالت نبی و رسول کی موت کے ساتھ منقطع ہو جاتی ہے جبکہ ولایت اس طرح منقطع نہیں ہوتی۔

(د) شیعہ کے نزدیک امام معصوم ہوتے ہیں۔ یہی دعویٰ صوفیا کا اولیا کے متعلق ہے اور ابن عربی نے فتوحات مکیہ میں اس کو واضح طور پہ بیان کیا ہے۔ اسی بنا پر صوفیا کسی مرید کے لیے یہ جائز نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے شیخ کے کسی فعل پر انگلی اٹھائے خواہ وہ کتنا خلاف شریعت ہو۔

(ہ) شیعہ کے نزدیک زمین کبھی امام سے خالی نہیں ہو سکتی اور صوفیا کے نزدیک زمانہ کسی ولی کامل کے بغیر نہیں ہوتا۔ اقطاب، اوتاد، ابدال وغیرہ دنیا کا انتظام سنبھالے ہوئے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

(و) شیعہ کا عقیدہ ہے کہ جس شخص نے امام زمانہ کو نہیں پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ صوفیا کے ہاں یہ عقیدہ اس طرح موجود ہے کہ جو شخص کسی شیخ کی اطاعت کا قلادہ گردن میں ڈالے بغیر رہے گا اس کا امام شیطان ہوگا۔ نیز شیخ کے بغیر اللہ کی عبادت ایسے ہی ہے جیسے غبار جو اڑ گیا۔

(ز) شیعہ اور صوفیا دونوں اپنے اماموں اور شیوخ کو ایک جیسے خطابات سے نوازتے ہیں۔

(ح) شیعہ اور صوفیا دونوں میں حلول اور تناسخ کا دعویٰ پایا جاتا ہے۔ دونوں شریعت کے ظاہر و باطن کو مانتے ہیں، دونوں تقیہ سے کام لیتے ہیں۔

(ط) شیعہ اور صوفیا دونوں اس بات کو مانتے ہیں کہ شریعت کو منسوخ کیا جا سکتا ہے چنانچہ صوفیا برملا اپنی کتابوں میں اپنے عشق و محبت کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ کئی صوفی علانیہ رمضان المبارک کی بے حرمتی کرتے ہیں اور شریعت کے احکام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے مراتب اتنے بلند ہو چکے ہوتے ہیں کہ شریعت کی پابندی سے انہیں آزاد کر دیا جاتا ہے۔

ان دلائل کو بیان کرنے میں علامہ صاحب نے نہایت کثرت سے کئی کتابوں سے استشہاد کیا ہے اور پورے حوالے نقل کیے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کو ایک مستشرق محقق براؤن کی تحقیق کے اس خلاصے پر ختم کیا ہے کہ شیعیت اور تصوف وہ دو اسلحہ تھے جن سے فارس نے عربوں کے ساتھ جنگ کی۔

حقیقت یہ ہے کہ تصوف ایک الگ نظام حیات ہے۔ اس کے اپنے اصول اور قواعد ہیں۔ اس کی الگ بنیادیں ہیں۔ اس کو زہد کا نام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ زہد میں ترک دنیا نہیں بلکہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ زہد شریعت کے احکام کی فرمانبرداری کی تعلیم دیتا ہے، وہ حرام کاموں میں پڑ نا نہیں سکھاتا۔ زہد کتاب و سنت پر مبنی ہے جبکہ تصوف نے نہ جانے کہاں کہاں سے فکر جمع کر کے ایک نئے طرز حیات کی طرح ڈالی ہے جس میں ہر شخص خالق کے اوصاف اپنانے کا دعویٰ کرتا ہے۔

کتاب عربی زبان میں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو تاکہ مسلمان ان مفاسد سے آگاہ ہو سکیں جو تصوف میں پائے جاتے ہیں اور اس راہ سے عوام الناس کی زندگی میں داخل ہو چکے ہیں۔ امید ہے ادارہ ترجمان السنۃ اس سلسلہ میں کوئی اقدام کرے گا۔

تفسیر سورۃ مائدہ (۵)

اے ایمان والو! شراب، جوا، تھان اور پانسے کے تیر بالکل نجس شیطانی کاموں میں سے ہیں تو ان سے بچو[۲۲] تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ تمہیں شراب اور جوئے میں لگا کر تمہارے درمیان دشمنی اور کینہ ڈالے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز[۲۳] سے روکے تو بتاؤ کیا اب تم ان سے باز آتے ہو۔ اور اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو ـــــ اور بچتے رہو۔ اگر تم اعراض کرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے۔ ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں جو انہوں نے کھائی جب کہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا، ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔ پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لائے، پھر تقویٰ اختیار کیا اور خوبی کے ساتھ اس کا حق ادا کیا[۲۴] اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے ۹۳۔

---

[۲۲] اس ممانعت کا حکم بقرہ ۲۱۹ اور مائدہ ۳ میں گزر چکا ہے۔

[۲۳] یعنی شیطان نے یہ فتنے اس لیے ایجاد کیے ہیں کہ تمہیں ان میں لگا کر تمہارے درمیان برابر دشمنی اور انتقام کی آگ بھڑکاتا رہے اور خدا سے غافل کر کے تمہیں خود اپنی قدر و قیمت سے بھی بے خبر کر دے۔ عرب کی تاریخ میں ایسی جنگیں موجود ہیں جن کی آگ جوئے یا شراب خانہ خراب نے بھڑکائی اور شراب آدمی کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے ہٹا کر جس طرح ایک خیالی دنیا میں لے جا کر پھینک دیتی ہے وہ معلوم ہے۔ اسلام نے زندگی کی تمام رفعت و عظمت، ذکر الٰہی کے ساتھ وابستہ کی ہے۔

[۲۴] شریعتِ الٰہی میں احکام کا نزول بالتدریج ہوا ہے اور یہ تدریج بندوں کی سہولت کے پہلو سے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ یہاں یہ واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پرسش کسی ایسی چیز کے کھانے پینے پر نہیں ہوگی جس کے

اے ایمان والو! اللہ تمہاری کسی ایسے شکار سے آزمائش کرے گا جو تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں آ جائے گا۔[۲۵] تاکہ اللہ دیکھے کہ کون اس سے غیب میں ڈرتا ہے اور جس نے اس کے بعد حدود سے تجاوز کیا تو اس کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اے ایمان والو، حالتِ احرام میں شکار نہ کیجیو، اور جو تم میں سے اس کو قصداً مارے گا تو اس کا بدلہ اسی طرح کا جانور ہے جیسا کہ اس نے مارا ہے۔ جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر کریں گے۔ یہ نیاز کی حیثیت سے خانہ کعبہ کو پہنچایا جائے یا کفارہ دینا ہوگا مسکینوں کو کھانا یا اسی کے برابر روزے رکھنے ہوں گے تاکہ وہ اپنے کیے کا وبال چکھے جو ہو چکا اللہ نے اس سے درگزر کیا۔ لیکن جو کوئی پھر کرے گا تو اللہ اس سے انتقام لے گا اور اللہ غالب اور انتقام والا ہے۔ اور تمہارے لیے دریا کا شکار، اور اس کا کھانا جائز کیا گیا، تمہارے اور قافلوں کے زادِ راہ کے لیے۔ اور خشکی کا شکار، جب تک تم احرام میں ہو، تم پر حرام کیا گیا۔ اس اللہ سے ڈرتے رہو جس کے حضور میں سب حاضر کیے جائیں گے۔ اللہ نے کعبہ ـــــ حرمت والے گھر ـــــ کو لوگوں کے لیے مرکز بنایا اور حرمت کے مہینوں، قربانی کے جانوروں اور گلے میں پٹے پڑے جانوروں کو شعیرہ[۲۶] ٹھہرایا۔ یہ اس لیے کہ تم جانو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے اور بڑا بخشنے والا اور مہربان بھی۔ رسول پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔ کہہ دو کہ ناپاک اور پاک

بارے میں کسی صریح ممانعت کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں ہوا ہے اس لیے شراب کے احکام کے بالتدریج نزول سے اگر کچھ لوگ رخصت کا فائدہ اٹھاتے رہے ہیں تو ان سے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں ہوا۔

[۲۵] حالتِ احرام میں شکار نہ کرنے کا حکم آزمائش کے طور پر ہے۔ یہ آزمائش بنی اسرائیل کے اس امتحان سے مشابہ ہے جو ان کو سبت کے معاملے میں پیش آئی۔ اس طرح کے ابتلائی احکام کا اصل مقصود خدا کے ساتھ بندوں کی وفاداری کو جانچنا ہوتا ہے۔

[۲۶] یہ دوسرے معروف شعائر کی بھی یاددہانی فرما دی کہ ان کے احترام سے متعلق بھی جو ہدایات دی گئی ہیں ان کو حرزِ جان بناؤ۔ کسی پہلو سے ان کی حرمت میں کوئی فرق نہ آئے۔ ان میں کعبۃ اللہ کا خاص اہتمام سے ذکر کیا ہے۔ کیونکہ ذریت ابراہیمؑ کی تمام دینی، سیاسی اور معاشی شیرازہ بندی اسی گھر کی بدولت تھی اور بعثتِ نبوی کے بعد یہی گھر ہے جو تمام امت کا قبلہ اور مرکز ہے۔

دونوں یکساں نہیں[۹۷] ہوسکتے۔ اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہیں فریفتہ کرنے والی[۹۸] ہو۔ پس اللہ سے ڈرتے رہو، اے اہلِ عقل، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ۱۰۰

اے ایمان والو! ایسی باتوں سے متعلق سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں گراں گزریں اور اگر تم ان کی بابت ایسے زمانے میں سوال کروگے جب قرآن اتر رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے ان پر درگزر فرمایا۔ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ اسی طرح کی باتیں تم سے پہلے ایک قوم نے پوچھیں تو وہ ان کے منکر ہوکر[۹۹] رہ گئے۔ اللہ نے تو نہ بحیرہ مشروع کیا، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، نہ حام۔ جنھوں نے کفر کیا ہے وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر سمجھ سے عاری ہیں۔ اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور

[۹۷] یعنی خدا کے نزدیک خیر و شر، نیکی اور بدی، فسق اور تقویٰ، نیکوکار اور بدکار دونوں یکساں نہیں ہیں۔ خدا خیر مطلق اور سراپا حق و عدل ہے۔ اس لیے وہ صرف طیب کو قبول فرمائے گا، خبیث کے لیے اس کے ہاں جہنم کی آگ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

[۹۸] یہ طیب کو اختیار کرنے کی راہ کے سب سے بڑے فتنہ سے آگاہ فرمایا ہے وہ یہ کہ بہت سے نادانوں کے لیے کسی برائی کی کثرت نہ صرف اس کی تقلید کے لیے محرک بلکہ اس کے جواز کے لیے ایک دلیل بن جاتی ہے۔ جو فتنہ عام ہو جاتا ہے اور جو بدی فیشن میں داخل ہو جاتی ہے وہ اپنے دروازے اس کے لیے چوپٹ کھول دیتے ہیں۔ اکثریت کا عمل ان کے لیے دلیلِ راہ بن جاتا ہے۔ فرمایا کہ اگرچہ کسی برائی کا غلبہ اور خبیث کی کثرت اپنے اندر کشش رکھتی ہے لیکن اہلِ عقل اس وبائے عام میں بھی اس کے اثرات سے محفوظ اور تقویٰ کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

[۹۹] مراد یہود ہیں جنھوں نے اپنے نبی سے سوالات و مطالبات کیے لیکن ان کو جب جواب دے دیئے گئے تو وہ ان کے منکر بن بیٹھے۔ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ اس نے غیر ضروری سوالوں کو نظرانداز فرما کر ہمیں اصر و اغلال سے بچا لیا ہے اور ان معاملات کو ہمارے عقل و اجتہاد پر چھوڑ دیا ہے۔

[۱۰۰] بحیرہ وہ اونٹنی جس سے پانچ بچے پیدا ہو چکے ہوتے اور ان میں آخری نر ہوتا۔ مشرکین عرب اس کے کان چیر کر آزاد چھوڑ دیتے۔ سائبہ: بیماری میں منت مانگ کر شفا ہونے پر آزاد کی ہوئی اونٹنی۔ وصیلہ: نر اور مادہ دو بچے ایک ساتھ جننے والی بکری۔ اس کا نر بچہ بتوں کی نذر کے قابل نہ سمجھا جاتا۔ حام، وہ سانڈ اونٹ جس کی کئی پشتیں پیدا ہو چکی ہوتیں، اس کو بھی آزاد چھوڑا جاتا۔ فرمایا ان جانوروں کے تقدس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

رسول کی طرف آؤ تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ جانتے رہے ہوں، نہ ہدایت پر رہے ہوں۔ اے ایمان والو، تم اپنی فکر رکھو۔ اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہوا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گا[۱۰۱]۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کا پلٹنا ہے۔ وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ ۱۰۵

اے ایمان والو! تمہارے درمیان گواہی بوقت وصیت جب کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچا ہو، اس طرح ہے کہ دو معتبر آدمی تم میں سے گواہ ہوں۔ یا دو دوسرے تمہارے غیروں میں سے، اگر تم سفر میں ہو اور وہیں تمہیں موت کی مصیبت[۱۰۲] آپہنچے۔ تم ان کو نماز کے بعد روک لو، پس وہ اللہ کی قسمیں کھائیں، اگر تمہیں شک[۱۰۳] ہو، کہ ہم اس کے بدلے میں کوئی قیمت قبول نہیں کریں گے، اگرچہ کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو، اور نہ ہم اللہ کی گواہی کو چھپائیں گے اگر ہم ایسا کریں تو بے شک ہم گنہگار ٹھہریں۔ پس اگر پتہ چلے کہ یہ دونوں کسی حق تلفی کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان کی جگہ دوسرے دو ان میں سے کھڑے ہوں جن کی مقدم گواہوں نے حق تلفی کی ہے پس وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی سے زیادہ راست ہے اور ہم نے کوئی تجاوز نہیں کیا ہے۔ اگر ہم نے ایسا کیا ہے تو ہم ظالم ٹھہریں[۱۰۴]۔ یہ طریقہ اس امر

[۱۰۱] اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں کو دوسروں کی ہدایت و ضلالت سے کوئی سروکار نہیں ہے انہیں بس اپنے نفس کی فکر کرنی چاہیئے۔ یہ خیال مسلمانوں کے فریضہ شہادت علی الناس کے خلاف ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر مشرکین تمہاری دعوت سے نہیں سنبھلتے تو ان کے غم میں پریشان نہ ہو، بلکہ اپنی فکر کرو۔

[۱۰۲] یہاں مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنانے کا حکم ہے لیکن اگر سفر میں دو مسلمان نہ مل رہے ہوں تو بدرجہ مجبوری غیر مسلموں ہی میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنایا جا سکتا ہے۔

[۱۰۳] قسموں اور معاہدوں کے باب میں زمانہ قدیم سے یہ رواج رہا ہے کہ ان کی تکمیل بالعموم معبدوں کے سامنے ہوتی۔ اس چیز کی اثر انگیزی ایک فطری چیز ہے اس لیے اسلام نے بھی اس کو اہمیت دی ہے۔ قسم لینے کی ضرورت اس صورت میں ہوگی جب گواہوں کے بارے میں کوئی شک ہو۔ اگر ان کے بارے میں کسی سوءِ ظن کا احتمال نہیں ہے تو خواہ مخواہ ان سے قسم لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

[۱۰۴] اپنے منصب کے اعتبار سے گواہی کے اصل حق دار وصیت کے ابتدائی گواہ ہیں اس لیے ان کو چاہیئے کہ وہ کسی بدعنوانی کے مرتکب نہ ہوں۔ البتہ ان کی گواہی پر ایک مزید احتساب کا موقع یوں پیدا کر دیا ہے کہ اگر وہ کسی کی جانب داری یا حق تلفی کریں تو ان کے اس رویہ سے متاثر ہونے والے دو آدمی قسم کھا کر ان کی گواہی کو باطل کر سکتے ہیں

کے قرین ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں یا اس بات سے ڈریں کہ ان کی گواہی کے بعد ان کی گواہی رد ہو جائے گی اور اللہ سے ڈرو اور سنو۔ اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ۵۴

اس دن کو یاد رکھو جس دن اللہ سب رسولوں کو جمع کرے گا پھر پوچھے گا کہ تمہیں کیا جواب ملا؟ وہ کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں۔ غیب کی باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔ ۵۵ جبکہ اللہ کہے گا، اے عیسیٰ بن مریم! میرے اس فضل کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کیا۔ جب کہ میں نے روح القدس سے تمہاری تائید کی۔ تم لوگوں سے کلام کرتے تھے گہوارے میں بھی اور ادھیڑ ہو کر بھی۔ اور یاد کرو جب کہ میں نے تمہیں کتاب، حکمت، اور تورات و انجیل کی تعلیم دی۔ اور یاد کرو جب کہ تم مٹی سے ایک صورت پرندے کی صورت کے مانند میرے حکم سے بناتے تھے پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتی تھی۔ اور تم اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے۔ اور یاد کرو جب کہ تم مُردوں کو میرے حکم ۵۶ سے نکال کھڑا کرتے تھے۔ اور یاد کرو جب کہ بنی اسرائیل کے شر کو میں نے تم سے دُور رکھا، جب کہ تم ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے تو ان کے کافروں نے

۵۵ قیام عدل و قسط اور شہادت حق کی ذمہ داری سورۂ مائدہ میں مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے تعلق سے یہ اس شہادت کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جو حضرات انبیاؑ علیہم السلام قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں دیں گے کہ انہوں نے اپنی اپنی امتوں کو وہ حق بے کم و کاست پہنچا دیا تھا جس کے پہنچا دینے کی ذمہ داری ان پر ڈالی گئی تھی۔ رہا بعد میں امتوں کا رویہ تو اس سے وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے، کیونکہ ان کا علم صرف دنیا میں اپنی موجودگی کے زمانے تک ہی محدود ہو گا۔

۵۶ سیدنا مسیحؑ سے سوال و جواب کا تفصیلی ذکر بطور مثال ہے۔ ان کے انتخاب کی حکمت یہ ہے کہ وہ اسرائیلی سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ ان کی شہادت یہود و نصاریٰ کے لیے بھی سبق آموز ہو سکتی تھی اور اس امت کے لیے بھی۔ لیکن مقصود یہ بتانا ہے کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام انبیاؑ سے شہادت لے گا۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح شہادت دیں گے، اور اسی شہادت کی بنا پر آپ کی اُمت پر حجت قائم ہو گی۔

۵۷ ان آیات میں "میرے حکم سے" کی تکرار نہایت بلیغ ہے۔ گویا نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے گی، کہ حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ پر جو انعام بھی ہُوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہُوا، انہوں نے جو معجزے بھی دکھائے سب اللہ کے اذن و حکم سے دکھائے تو نصاریٰ نے کس چیز کی بنا پر ان کو خدا بنا ڈالا۔

کہا کہ یہ تو بس صریح جادو ہے۔ اور یاد کرو جب کہ میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسُول پر ایمان لاؤ تو وہ بولے کہ ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔ یاد کرو جب کہ حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم، کیا تمہارا رب یہ کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک خوان اتارے۔ اس نے کہا اللہ سے ڈرو اگر تم سچے مومن ہو۔ ۵۸ وہ بولے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم یہ جان لیں کہ تُو نے سچ کہا اور ہم اس کی گواہی دینے والے بنیں۔ عیسیٰ ابن مریم نے دُعا کی، اے اللہ! ہمارے پروردگار! تو ہم پر آسمان سے ایک خوان اتار جو ہمارے لیے ایک یادگار بن جائے، ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے اور تیری طرف سے ایک نشانی ٹھہرے۔ عطا فرما تو بہترین عطا فرمانے والا ہے۔ اللہ نے فرمایا، میں یہ خوان ضرور تم پر اتاروں گا ۵۹ لیکن اس کے بعد جو تم میں سے کفر کرے گا، تو میں اس کو سزا بھی وہ دوں گا جو جہان والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا۔ اور یاد کرو جب کہ اللہ پوچھے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود ۶۰ بناؤ۔ وہ جواب دے گا تو پاک ہے، میرے لیے کیسے روا تھا کہ

۵۸ حواریوں کا یہ سوال خدا کی قدرت سے متعلق نہیں بلکہ اس کی حکمت سے متعلق تھا یعنی یہ کہ اس قسم کی کھلی ہوئی نشانی دکھانا کیا۔ اس کی حکمت کے مطابق بھی ہو گا؟ حواری با ایمان لوگ تھے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ ان کی یہ درخواست مشابہ ہے اس مطالبہ سے جو یہود نے خدا کو دیکھنے کے لیے کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بھی ان کو اس سوال سے روکا۔

۵۹ حواریوں کی دوبارہ درخواست پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہُوا کہ اتارنے کو تو میں ایک خوان اتاروں گا، لیکن جو لوگ اتنی کھلی نشانیاں دیکھنے کے بعد کفر میں مبتلا ہوں گے تو ان کو سزا بھی وہ دوں گا جو کسی اور کو نہ دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے اس کے بعد حواری اپنی درخواست سے باز آ گئے کیونکہ انجیلوں میں نزول مائدہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

۶۰ اُوپر جو باتیں مذکور ہوئی ہیں ان سے مقصود نصاریٰ کی تفضیح ہے لیکن یہ بالواسطہ ہے۔ اس سوال میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ سے نصاریٰ کی اصل گمراہی کے بارے میں پُوچھے گا کہ کیا تم نے نصاریٰ کو یہ تعلیم دی تھی، کہ اللہ کے سوا مجھ کو اور میری ماں کو بھی معبود بناؤ۔ اس سوال سے مقصود یہ ہو گا کہ نصاریٰ جنہوں نے حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ کو خدا کا شریک بنایا۔ حضرت عیسیٰؑ کی گواہی سے بھرے مجمع میں رسوا ہوں

میں وہ بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے یہ کہی تو تو اسے جانتا ہے۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے پر میں نہیں جانتا جو تیرے دل میں ہے۔ غیب کی باتوں کا جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔ میں نے تو ان سے وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا، کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ اور میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں موجود رہا۔ پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان پر نگران رہا اور تو تو ہر چیز پر گواہ ہے ہی۔ اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے[۹۱]۔ اللہ فرمائے گا آج سچوں کو ان کی سچائی کے نفع پہنچانے کا دن ہے۔ ان کے لیے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی بڑی کامیابی ہے[۹۲] آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۲۰-

---

۹۱ سیدنا مسیحؑ کے اس فقرے کی بلاغت کی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ یوں کہتے کہ "اگر تو ان کو معاف کر دے تو یہ تیرے بندے ہیں ۔ ۔ ۔" تو یہ فقرہ واضح الفاظ میں نصاریٰ کے لیے شفاعت بن جاتا، اور انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ مشرکین کے لیے سفارش نہیں فرمائیں گے۔ اس لیے سیدنا مسیحؑ کی بات کا اسلوب ایسا ہے کہ بات سچی بھی ہے، دربارِ الٰہی کے شایانِ شان بھی ہے، دردمندانہ بھی ہے اور اس سے حضرت عیسیٰؑ نے اپنے آپ کو مشرکین کی شفاعت کی ذمہ داری سے بھی بری کر لیا ہے۔

۹۲ یعنی آج کا دن راست بازوں کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کے ظہور کا دن ہے۔ بدعہدوں، خائنوں اور جھوٹی آرزوؤں میں زندگی گزارنے والوں کے لیے آج حسرت و نامرادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

نمازوں کے اوقات (۳)

مؤطا امام مالک کی کتاب وقوت الصلوٰۃ کی احادیث

۱۵- حدثني يحيى عن مالك عن ابن شهاب عن ابي سلمة بن عبد الرحمن عن ابي هريرة أنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلٰوةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلٰوةَ۔

... حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے نماز (با جماعت) میں سے ایک رکعت پالی اس نے نماز پالی۔

یہ روایت صحیح بخاری ——— کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب ۲۹ ——— اور صحیح مسلم ——— کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، باب ۳۰ ——— میں بھی ہے۔

رکعت رکوع اور دو سجدوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان میں کسی نوعیت کی کمی رکعت کو فوت کر دیتی ہے۔ رکعت کے لیے رکوع کا ملنا لازمی ہے۔ یعنی رکوع کا اعتبار اصل ہے۔ جب رکوع ضائع ہو گیا تو سجدہ بھی نہیں ہوا۔

باجماعت نماز میں ایک رکعت کا ملنا جماعت کا ملنا ہے۔ یعنی اگر ایک شخص ایک رکعت میں بھی شریکِ نماز ہو گیا تو اس کو پوری نماز باجماعت مل گئی۔ فوت شدہ رکعتوں کو وہ پورا کر کے اس کی نماز

کی تکمیل ہو جائے گی۔ ان کی بنا پر وہ باجماعت نماز میں شرکت کے ثواب سے محروم نہ رہے گا۔

رہا یہ سوال کہ ایسے شخص کو پوری باجماعت نماز کا ثواب بھی مل جائے گا تو اس میں ہمیں کلام ہے کیونکہ اگر اس نے جماعت میں بروقت پہنچنے کا ضروری اہتمام ملحوظ نہیں رکھا اور اس معاملہ میں سُستی کے باعث اس کی رکعتیں فوت ہوتی ہیں تو یہ اس کی جانب سے ایک کوتاہی ہے۔ اس کوتاہی کے سبب سے وہ نماز کے جس حصّہ سے محروم ہو گیا کوئی دوسری چیز اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔

۱۶۔ وَحدثنی عن مالك عن نافع اَنَّ عَبْدَ اللهِ ابْنَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ كَانَ يَقُوْلُ : إِذَا فَاتَتْكَ الرَّكْعَةُ فَقَدْ فَاتَتْكَ السَّجْدَةُ ۔

□ ... نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے: جب تمہارا رکوع چھوٹ گیا تو تمہارا سجدہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔

۱۷۔ وحدثنی عن مالك اَنَّهُ بلَغَهُ اَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ وَزَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ كَانَا يَقُوْلَانِ : مَنْ اَدْرَكَ الرَّكْعَةَ فَقَدْ اَدْرَكَ السَّجْدَةَ ۔

□ ... امام مالک روایت کرتے ہیں کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ، دونوں کا فتویٰ یہ تھا کہ جس نے رکوع پالیا اس نے سجدہ پالیا۔

ان روایات سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ رکعت ملنے کے لیے مجرد سجدہ کا ملنا کافی نہیں ہے، بلکہ رکوع سے ہی سجدہ مقبول ہوگا اور اگر رکوع نہیں ملا تو سجدہ بھی فوت شدہ متصور ہوگا یعنی اگر آپ نماز میں اس وقت شامل ہوئے جب امام کو سجدے میں پایا تو وہ رکعت آپ کو نہیں ملی۔ وہ پوری رکعت آپ کو پڑھنی پڑے گی۔ آپ کا سجدہ رکعت کے لیے کفایت نہیں کرے گا۔ گویا

رکوع کا فوت ہونا رکعت کا فوت ہونا ہے۔

۱۸۔ وحدثنی یحیٰی عن مالك اَنَّهُ بَلَغَهُ اَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ كَانَ يَقُوْلُ : مَنْ اَدْرَكَ الرَّكْعَةَ فَقَدْ اَدْرَكَ السَّجْدَةَ. وَمَنْ فَاتَهُ قِرَاءَةُ اُمِّ الْقُرْاٰنِ فَقَدْ فَاتَهُ خَيْرٌ كَثِيْرٌ۔

□ ... امام مالک سے روایت ہے کہ ان کو یہ بات پہنچی کہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے تھے کہ جس نے رکوع پالیا تو اس نے سجدہ پالیا اور جس کی ام القرآن کی قراءت فوت ہو گئی تو اس سے بہت بڑا خیرِ کثیر فوت ہو گیا۔

ام القرآن سے مراد سورۂ فاتحہ ہے اور فَقَدْ فَاتَهُ خَيْرٌ كَثِيْرٌ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ خیرِ کثیر ہے۔ نماز میں اس سے محرومی ایک بڑی نعمت سے محرومی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کے اس ارشاد سے ہمارے اوپر بیان کیے گئے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ نماز میں جو کمی ہو جائے گی وہ بہرحال کمی ہے، اس کمی کا بدل کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ اگر آپ کو فاتحہ کی قراءت نہیں ملی البتہ رکوع مل گیا تو آپ کو رکعت تو مل گئی، لیکن بڑا خیرِ کثیر ہے کہ جس سے آپ محروم ہو گئے۔ علیٰ ہذا القیاس تکبیروں میں بھی یہ بات ہے کہ جس کو تکبیر تحریمہ مل گئی اس کو بڑی نعمت مل گئی۔ اس کا فوت ہونا بھی ایک بڑی نعمت کا فوت ہونا اور خیر و برکت سے محروم ہونا ہے۔

الغرض اس نوعیت کی جو کمیاں نماز میں ہوں گی وہ بہرحال کمیاں ہیں، لیکن قاعدے کے مطابق امام کے ساتھ رکوع مل جانے سے رکعت مل جائے گی۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ فقط سجدہ مل جانے پر آپ رکعت کے پانے والے بن جائیں گے۔

ان روایات سے یہ بات نہیں نکلتی کہ اگر سورۂ فاتحہ سے محرومی کا حادثہ پیش آ جائے تو آپ اس کی تلافی کے خیال سے امام کی قراءت کے وقفوں میں یا اس کی قراءت کو نظر انداز کر کے فاتحہ پڑھنے لگیں اس لیے کہ حکم ہے کہ "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ" (الاعراف - ۷ : ۲۰۴) (اور جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے)۔

نماز میں فاتحہ کے باب میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رہے گا :

۱۔ 'لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب' (فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں ہے) کے حکم کی تعمیل میں امام اگر قراءت کر رہا ہے تو خاموشی سے سنیں اور فاتحہ کے اختتام پر آمین کہیں، خواہ بلند آواز سے کہیں یا دل میں، اس لیے کہ آمین کہنے کے معنی یہ ہیں کہ میں امام کی اس بات کی تائید کرتا ہوں۔

۲۔ وقفات میں قراءت ٹھیک نہیں ہے۔

۳۔ امام کی آواز سے اپنی آواز ٹکرانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

۴۔ جب امام بلند آواز سے قراءت نہیں کر رہا ہے تو مقتدی کو اپنے دل میں قراءت کرنی چاہیے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بات خاموش رہنے سے زیادہ معقول نظر آتی ہے کہ آپ دل میں تلاوت کریں۔

۱۹- وَحَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ يَقُولُ: دُلُوكُ الشَّمْسِ مَيْلُهَا۔

... امام مالک سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ 'دلوکِ شمس' سے مراد سورج کا ڈھل جانا ہے۔

۲۰- وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ دَاوُدَ بْنِ الْحُصَيْنِ قَالَ: أَخْبَرَنِي مُخْبِرٌ أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ كَانَ يَقُولُ: دُلُوكُ الشَّمْسِ إِذَا فَاءَ الْفَيْءُ وَغَسَقُ اللَّيْلِ اجْتِمَاعُ اللَّيْلِ وَظُلْمَتُهُ۔

... داؤد بن حصین بیان کرتے ہیں کہ ایک خبر دینے والے نے مجھے خبر دی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے تھے کہ 'دلوک شمس' سے مراد وہ وقت ہے جب کہ سایہ پلٹ جائے اور 'غسقِ لیل' سے مراد رات کا اجتماع اور اس کی تاریکی کا بڑھ جانا ہے۔

ان دونوں روایات میں 'دلوك الشمس' (سورج کے ڈھلنے) اور 'غسق اللیل' (رات کے تاریک ہونے) کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ دونوں الفاظ قرآن مجید کی ایک ہی آیت میں یوں آئے ہیں :

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ	نماز کا اہتمام رکھو زوالِ آفتاب کے اوقات
إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ	سے لے کر شب کے تاریک ہونے تک۔

(بنی اسرآءیل - ۱۷ : ۷۸)

چونکہ ان کے ٹھیک ٹھیک مفہوم کے تعین میں اختلاف پیدا ہوا ہے اس لیے امام مالک نے اپنی اس کتاب میں اس کو طے کرنا چاہا ہے اور ان روایات کی روشنی میں ان وقتوں کی نہایت وضاحت کے ساتھ تشریح کر دی ہے۔

'دُلُوك' کے معنی زوال کے ہیں۔ سورج کے زوال کے تین درجے ہیں: ایک وہ جب وہ سمتِ راس سے ڈھلتا ہے، دوسرا جب مرئ العین سے نیچے کی طرف جھکتا ہے، تیسرا جب وہ افق سے غائب ہوتا ہے۔ یہ تینوں اوقات ظہر، عصر اور مغرب کی نمازوں کے ہیں۔

'فَاءَ الْفَيْءُ': جب کہ ہر چیز کا سایہ پلٹ جائے۔ قاعدہ ہے کہ جوں جوں سورج سمتِ راس کی طرف جاتا ہے ہر چیز کا سایہ اس کے قدموں کی طرف گھٹتا چلا جاتا ہے۔ جب سورج سمتِ راس سے ڈھل جاتا ہے تو سایہ اپنی کم از کم مقدار کو پہنچ کر پھر سے بڑھنے لگتا ہے۔ اس کو سایہ کا پلٹنا کہا ہے۔

'غَسَقِ اللَّيْلِ': اول شب کی تاریکی جب کہ وہ گاڑھی ہو جائے۔ اس میں وہ وقت شامل نہیں ہوگا جس میں مغرب کے بعد شفق پر سرخی نظر آتی ہے بلکہ اس کے غائب ہو جانے کے بعد جب رات مکمل طور پر تاریک ہو جاتی ہے۔ تب جا کے عشاء کا اول وقت ہوتا ہے۔

۲۱ — حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: الَّذِي تَفُوتُهُ صَلٰوةُ الْعَصْرِ كَأَنَّمَا وُتِرَ أَهْلَهُ وَمَالَهُ۔

[ ] ... حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کی عصر کی نماز فوت ہو گئی تو گویا اس کو اہل وعیال اور مال کی آفت سے دوچار ہونا پڑا۔

یہ روایت صحیح بخاری ـــــ کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب ۱۴ ـــــ اور صحیح مسلم ـــــ کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ، باب ۳۵ ـــــ میں بھی ہے۔

دین میں نماز کی جو اہمیت اور مرتبہ ومقام ہے وہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نعمتِ غیر مترقبہ کا درجہ دیا ہے اور اس کے ضیاع اور بالخصوص نمازِ عصر کے ضیاع کو ایک عظیم حادثہ قرار دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ اگر عصر کی نماز فوت ہو جائے تو یہ اتنا عظیم حادثہ ہے کہ آدمی کو یہ سمجھنا چاہیے کہ گویا اس کے اہل وعیال اور مال و دولت پر تاخت ہوئی اور وہ سب سے محروم ہو گیا۔

قرآن مجید میں بھی خاص طور پر نمازِ عصر کی یہ اہمیت بیان ہوئی ہے:

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ	نمازوں کی نگہداشت رکھو، خاص طور پر بیچ کی نماز کی۔
(البقرۃ-۲ : ۲۳۸)	

ہمارے نزدیک یہاں صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد عصر ہی ہے۔

یہی نمازِ عصر ہے کہ جس کے بارے میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو ابتلاء پیش آیا۔ جس میں غلبۂ حال سے بے بس ہو کر انہوں نے اپنے گھوڑوں ہی کے اوپر تلوار چلانی شروع کر دی کہ یہی دنیا میرے لیے فتنے کا باعث بنی۔ یہی وہ نماز ہے کہ جس میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غزوۂ احزاب میں ابتلاء پیش آیا۔

واقعہ یہ ہے کہ عصر کا وقت لوگوں کی ضروریات، دلچسپیوں، مشاغل اور حالات کے اعتبار سے بھی کچھ ایسا کہ اس وقت ہر شخص کے اوپر آپا دھاپی کی حالت ہوتی ہے۔ ہر دکاندار اپنی دکان بڑھانے سے پہلے کچھ کما لینا چاہتا ہے، کھلاڑی میدان میں بازی جیتنے کی بھاگ دوڑ میں ہوتے

ہیں، ملازم اپنے اپنے گھروں کو سدھار رہے ہوتے ہیں اور مسافر چاہتے ہیں کہ رات ہونے سے پہلے وہ منزل تک پہنچ جائیں۔ یہ وقت نہایت مختصر ہوتا ہے اس لیے ذرا سی کوتاہی سے نماز کا وقت نکل جاتا ہے۔ نماز کے فوت ہو جانے کی سنگینی کا یہاں ہمیں اندازہ نہیں ہو سکتا، لیکن آخرت میں جب اوّل وقت نماز پڑھنے کا اجر اور اس کے بعد اس کے ضائع ہونے کا نقصان معلوم ہو گا تب آدمی کو ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو گا کہ فی الواقع اس نے کتنی بڑی چیز کھوئی تھی اور کتنی حقیر چیز اس کے بدلے میں پائی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اندازہ کرانے کے لیے اسے یوں تعبیر کیا ہے کہ ایک شخص کے لیے جتنا بڑا یہ حادثہ ہے کہ اس کے تمام اہل وعیال اور مال تباہ ہو جائیں اتنا بڑا حادثہ نمازِ عصر کا فوت ہو جانا بھی ہے۔ اگر کسی شخص کا یہ تصور نہ ہو تو گویا اس نے نماز اور خاص طریقے پر نمازِ عصر کی قدر وقیمت نہیں پہچانی۔

۲۲ـــــ وحدثني عن مالك عن يحيىٰ بن سعيد اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ انْصَرَفَ مِنْ صَلٰوةِ الْعَصْرِ فَلَقِيَ رَجُلًا لَمْ يَشْهَدِ الْعَصْرَ. فَقَالَ عُمَرُ: مَا حَبَسَكَ عَنْ صَلٰوةِ الْعَصْرِ؟ فَذَكَرَ لَهُ الرَّجُلُ عُذْرًا. فَقَالَ عُمَرُ: طَفَّفْتَ.

[ ] ... یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ عصر کی نماز سے لوٹ رہے تھے تو ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو عصر کی نماز میں حاضر نہیں ہوا تھا۔ تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ عصر کی نماز سے آپ کو کس چیز نے روکا؟ تو ان صاحب نے ایک عذر بیان کیا تو آپ نے فرمایا: آپ نے بڑا خسارہ اٹھایا۔

'رَجُلًا': ایک شخص، دوسری روایات میں تصریح ہے کہ حضرت عمرؓ کے مخاطب سیدنا عثمان غنیؓ تھے۔

'تَطْفِيْفٌ' کے معنی کمی کرنے کے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے: 'وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ' (المطففین - ۸۳-۱) (برا ہو ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا)۔ 'طَفَّفْتَ' کے معنی ہیں کہ

آپ نے بڑی کمی کی. یعنی اپنے حق، اجر، درجے اور مرتبے کے معاملے میں آپ نے بڑا شدید خسارہ اٹھایا۔

اس روایت سے دین میں نماز کی غایت درجہ اہمیت بھی واضح ہوتی ہے اور اسلام میں خلیفہ کا مقام بھی معلوم ہوتا ہے۔ خلیفۂ وقت حضرت عثمان غنیؓ جیسے بلند پایہ انسان کو بھی اگر دیکھے کہ وہ نماز میں نہیں ہیں تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس کو ٹوکے۔ حضرت عثمانؓ نے اس طرح ٹوکے جانے کا برا نہیں منایا بلکہ اپنا عذر بیان کیا۔

'طَفَّفْتَ' کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ نماز میں کوتاہی پر سخت سے سخت وارننگ بھی دے سکتا۔ اگر حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کو یہ بات کہہ سکتے ہیں تو آج کل کے اربابِ حکومت کو بھی چاہیے کہ اس کی روشنی میں اپنے اعمال وکردار کو دیکھیں۔

اس روایت کے ذیل میں امام مالک نے 'تطفیف' کی وضاحت بھی کر دی: 'ویقال لکل شیء وفاء وتطفیف' (ہر شے کے لیے ایک درجہ تو اس کے وفا یعنی پورے ہونے کا ہے اور ایک درجہ اس کے تطفیف، یعنی کمی کرنے کا ہے)۔ یعنی جتنے بھی اعمالِ صالحہ ہیں ان کا ایک درجہ ومقام تو یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک کانٹے کی تول، جیسا کچھ ہونا چاہیے، ان کا حق ادا ہو گیا۔ جو اجر ملنا چاہیے تھا عمل کرنے والے نے اسے حاصل کر لیا اور جو ثواب اس کے لیے مقرر ہے وہ اس کا حق دار بن گیا۔ یہ وفا کا درجہ ہے۔ اعمال میں دوسرا درجہ تطفیف یعنی کمی اور خسارے کا ہے۔ جو اس کے برعکس ہوگا۔ اس کی نوعیت نماز کے معاملے میں یوں ہوگی کہ اول تو اصل وقت ہی گزار دیا اور پڑھی تو اس طریقے سے کہ جلدی میں کچھ پڑھا اور کچھ چھوڑ بھی گئے جیسے مرغ چونچیں مار رہا ہو۔ ایسی نماز از روئے فقہ ادا تو ہو جائے گی لیکن یہ درجہ تطفیف کا ہوگا، وفا اور کمال کا ہرگز نہیں ہوگا۔

(ترتیب: ماجد خاور)

حکمتِ قرآن (۴)

حکمت کی جستجو

حکمت اور نظمِ قرآن کا باہمی تعلق

قرآن مجید کا نظم بے شمار پہلوؤں سے حکمت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ لہٰذا جو شخص نظم پر غور کرے گا، لازم ہے کہ اس کی رسائی گہری حکمتوں تک ہو جائے۔ اب ہم قرآن مجید کی رہنمائی کے ایک خاص پہلو پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ نظمِ قرآن کی تلاش بھی حکمت پر مبنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمت کے دروازے سے داخل ہو کر ہی نظمِ قرآن تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ جو شخص غور کرنے کے اس انداز سے محروم ہے وہ نظمِ قرآن کو نہیں پا سکتا، بلکہ یا تو وہ اس کا انکار کر دے گا، یا اُس سے بُعد محسوس کرے گا۔ لیکن جس شخص کو یہ یقین ہو کہ قرآن ایک منظم کتاب ہے اور وہ اِس میں نظم کا متلاشی ہو تو یہ جستجو اس کو حکمت کے دروازوں تک لے جائے گی، اِس طرح وہ مقصد تک رہنمائی حاصل کر سکے گا۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے جس کے حق میں نصِ قرآنی موجود ہے۔

اِس امر کی تفصیل یُوں ہے کہ متناسب امور کو منظم کرتے وقت ان کے بلند اصولوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جب تک ایک شخص کی نظر امور کے اختلاف ہی میں اُلجھ کر رہ گئی ہو اور اس سے بالاتر نہ ہو سکی ہو تو وہ ان کو بے جوڑ اور متفرق پائے گا، لیکن جب اس کی نظر اصول تک پہنچ جائے، تو وُہ متناسب امور کی ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت کو جان جائے گا۔ اِس حقیقت کی طرف رہنمائی سورہ زخرف کی آیت ۴ سے ملتی ہے:

وَاِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ (۴۳: ۴)

اور بیشک یہ (قرآن) اصل کتاب میں ہمارے پاس ہے نہایت بلند اور پُر حکمت۔

قرآن مجید کے بلند ہونے کی صفت اس کے حکمت سے متصف ہونے کو لازم کرتی ہے۔ حکمت

ایک طرف مختلف امور کے لیے سمائی اور احاطہ کا باعث بنتی ہے تو دوسری طرف متقابل اور منتشر امور کو ایک جامع نظام کے تحت لاتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کو ترتیب دے اور ایک نظم میں بھی پرودے۔ چونکہ حکمت کا مفہوم ہی پختہ کرنا اور یقینی بنانا ہے، اس لیے جب کلام کی عمارت ہی غلط طور پر اٹھائی گئی ہو اور اس کے اجزا میں ترتیب کی خرابی پائی جائے تو یہ بات حکمت کے منافی ہے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کی خاطر قرآن مجید کے لیے عزیز اور حکیم کی صفات آئی ہیں۔ اسی حقیقت پر استدلال کرتے ہوئے کبھی یوں فرمایا ہے کہ یہ کتاب ایک حکیم ذات کی جانب سے ہے مثلاً:

اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (فصلت ۴۱ : ۴۱)	بے شک یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے، اس میں باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہوسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ خدائے حکیم و حمید کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ اتاری گئی ہے

اس آیت میں قرآن کی مضبوطی کو تو 'عزیز' ہونے کے حوالے سے ایک نص سے بیان کیا، جب کہ اس کی حکمت کو خدائے حکیم کی صفت کا تقاضا قرار دیا کیونکہ حکیم کبھی ایسا کلام نہیں کہتا جس تک باطل کا ہاتھ پہنچ سکتا ہو، جب اس کی اپنی ذات میں اور اس کے بنائے ہوئے نظام میں کوئی خلل نہیں تو اس کے کلام میں کیسے نقص ہو سکتا ہے؟ اس آیت میں حمید کی صفت لا کر کلام کے حسن کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

حکمت نظمِ قرآن میں پوشیدہ ہے:

علم کی وسعت اور بلندی کے ساتھ ساتھ اگر اخلاق میں پاکیزگی اور دل میں کشادگی پیدا نہ ہو تو اس کا سبب دل کی عدم آمادگی اور خباثت ہوتی ہے۔ ہر اقدام اور روگردانی کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ دل جب علم کی موافقت اختیار کرنے سے روگردانی کرتا ہے تو اس کا اثر دل کی سختی میں اضافہ اور اس کی تاریکی کی صورت میں نکلتا ہے، جیسا کہ فرمایا:

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف ۶۱ : ۵)	تو جب وہ کج ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل کج کر دیے۔
بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (النساء: ۱۵۵)	بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔ تو وہ کم ہی ایمان لائیں گے۔

یہ ایک واضح اور مضبوط بنیادی حقیقت ہے۔ اسی کا لحاظ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے حکمت کو نظمِ کلام کے اندر چھپا دیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کو کلام کے ظاہر میں نمایاں فرما دیتا اور پوشیدہ نہ رکھتا تو اس کا نقصان بہت شدید ہوتا، کیونکہ واقفیت حاصل ہو جانے کے بعد اعمال و اخلاق میں سے جو کچھ اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے وہ بہت مشکل نظر آتا ہے۔ لہٰذا اگر حکمت ظاہر ہوتی تو خطرہ تھا کہ عام لوگ اسے قبول نہ کرتے اور اس کو جھٹلا دیتے۔ تعلیم میں جو تدبیر ملحوظ رکھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آسان سے مشکل کی طرف درجہ بدرجہ بڑھا جائے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر شریعت کی تعلیم سنت کی طرف پھیر دی گئی، اور حکمت کو موقع کلام میں غور و تدبر کی طرف پھیر دیا گیا، تاکہ جوں جوں واقفیت بڑھے، اس کے نتیجہ میں درجہ بدرجہ عمل اور اخلاق میں بھی قدم بڑھیں۔ پس کسی ایسے شخص کو حکمت عطا کرنا، جس کے اخلاق پاکیزہ نہ ہوں اور جو بلندی کی طرف جانے کی جدوجہد نہ کرتا ہو، محض حکمت کو ضائع کرنا ہی نہیں ہوتا، بلکہ یہ چیز دل کے غرور اور سختی میں اضافہ کرتی اور نتیجۃً سستی اور ظلمت پیدا کرتی ہے۔

قرآن مجید نے مذکورہ دونوں باتوں سے ہمیں آگاہ فرما دیا ہے۔ چنانچہ اس نے بہت سی آیات میں ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور آپ کے عمل کو اپنے لیے نمونہ بنانے کی تلقین کی، اور ہمیں رغبت دلائی اور اس کی مخالفت سے بچنے کا حکم دیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہمیں ترغیب دی ہے کہ ہم آنحضرتؐ کی سنت اور پسند یا ناپسند کاموں میں آپ کے طریقہ کی جستجو کریں، تاکہ ہمیں اپنی ضرورت کے امور میں احکام شریعت کی تفصیل معلوم ہو سکے۔ ٹھیک اسی طرح قرآن مجید نے ہمیں بے شمار آیات میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے عجائبات میں غور کرنے کا حکم دیا، اور اس کے متعدد پہلو بیان کیے جن سے خدا کی حکمت اور رحمت کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ ہم علم میں پختہ ہوں اور اس کے نتیجے میں ہمارے ایمان، حکمت، نور اور بصیرت میں اضافہ ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح شریعت اور ظاہری احکام کی تعلیم دی، اسی طرح حکمت کی تعلیم بھی دی۔

حکمت کی پہچان کا طریقہ:

جب آپ کسی چیز کو پہچان جاتے ہیں تو پھر یہ بات آپ کے لیے مشکل نہیں رہ جاتی کہ آپ اس کے مختلف پہلوؤں، اس کے اثرات، اسباب، علامات اور اس سے ملتی جلتی ہُوئی یا اس سے مختلف چیزوں کو پہچان جائیں۔ پہچان کے بعد آپ کو وہ الفاظ و مضامین بھی مل جاتے ہیں جن سے آپ اِس چیز کے ناموں، اس کی صفات، اس کے افعال اور اس سے ملتی ہُوئی یا مختلف چیزوں کو تعبیر کریں۔ یہ مرکز سے اطراف پر غور کرنے کا طریقہ ہے جو نہایت واضح اور استعمال میں ہے۔ اس کے بالمقابل طریقہ یہ ہے کہ آپ اطراف سے مرکز کی طرف بڑھیں اور ایک حقیقت کو اس کے مختلف پہلوؤں، اس کے اسباب، علامات اور لوازم وغیرہ کی روشنی میں تلاش کریں۔ ایک محقق کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں طریقوں کو استعمال میں لائے۔

جہاں تک حکمت کا تعلق ہے قرآن نے اس کو پہچنوانے کے دونوں طریقے استعمال کیے ہیں: متعدد مقامات پر اس نے صراحت کے ساتھ یہ بتا دیا ہے کہ فلاں چیز حکمت میں سے ہے۔ اہلِ زبان نے حکمت کے مفہوم کو بھی واضح کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود بعض اسباب کی بناء پر لوگوں نے حکمت کی پہچان میں غلطی کی ہے۔ انہوں نے اس کے نام کا اطلاق دوسرے معانی پر یا اصل معنی کے کسی جزوی پہلو پر کر دیا۔ بہت سے لوگوں کو اس کے ثمرات میں سے کچھ حصّہ اور اس کی چمک دمک میں سے کوئی کرن ہاتھ لگ گئی، لیکن انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ حکمت میں سے ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ایک شخص کو نہایت عمدہ اور قیمتی موتی ہاتھ لگ جائے لیکن وہ اس کی قدر و قیمت سے بے بہرہ ہو۔ اس کی کیفیت اس شخص کی سی ہے، جس کو تقوٰی اور امانت کی خلعت عطا کی گئی ہو اور وہ اس کو پانے کے بعد دنیا کی زیب و زینت کی طرف متوجہ ہو گیا، دنیا کا حقیر اور ناپاک ہونا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور وہ دنیا داروں پر رشک کرنے لگا، گویا اس کی نگاہ ان مفاسد پر نہیں پڑی جو ان دنیا داروں نے اپنے لیے سمیٹ لیے ہیں۔

ایک عارف حکیم کا طریقہ یہ نہیں؛ بلکہ جب وہ حکمت کے سرچشمہ پر پہنچتا ہے تو اس سے سیراب ہوتا ہے، اس کی ٹھنڈک اور لذّت سے فیض یاب ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ اللہ کی نعمت ہے۔ اس کے برعکس جب وہ دنیا داروں کو دیکھتا ہے تو وہ ان کی حالت پر اسی طرح ترس کھاتا ہے جس طرح کوئی شخص کسی انسان کو مُردار کھاتے یا نجاست میں آلودہ ہوتے دیکھے تو اس پر اسے ترس آتا ہے۔ پس حکیم وہ ہے جس کو سمجھ عطا ہُوئی، اس نے حق کو پہچانا اور اس پر مطمئن ہو گیا، وہ باطل سے دُور رہا اور اسے اپنی عزت اور پاکیزگی کا شعور حاصل رہا۔ یہی شخص صبر اور شکر کی صفات سے واقعتہً متصف ہے۔ حضرت نوحؑ و حضرت

ابراہیمؑ سے لے کر حضرات موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاؑ اور ان کے رفقاءؓ و اصحاب کے اخلاق کو یاد کیجئے، پھر ان لوگوں کو یاد کیجئے، جو ان کی پیروی کرتے رہے، اور خُدا سے ڈرنے والے، حق کے لیے آنکھیں کُھلی رکھنے والے اور کتاب و سُنّت کو لازم پکڑنے والے ہُوئے۔ ان سب نے باقی رہنے والے خیر کو اختیار کیا اور فنا ہونے والی ادنیٰ چیزوں میں ملوث نہیں ہُوئے۔ پھر ربِ کریم سے دُعا کیجئے کہ وہ آپ کو نبیوں، صدیقوں، شہداء اور صالحین کے اس عالی مقام زمرہ میں جگہ عطا فرمائے۔

فطرتِ انسانی میں حکمت:

وہ اصول جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودلیعت کیے ہیں، سب سے زیادہ واضح ہیں لیکن ان کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص اگرچہ ظلم اور تکبر کی بنا پر ان کا انکار کر دیتا ہے۔ تاہم جب اسے جھنجھوڑا جائے تو ان کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی لیے یہ مناسب نہیں ہوتا کہ ان اصولوں کو پہلی ہی بار صراحت سے بیان کر دیا جائے بلکہ مناسب یہ ہے کہ پہلے ان کو نمایاں کیا جائے پھر درجہ بدرجہ ان کے تقاضے بتائے جائیں۔ یہ فطری اصول نہایت گہری جڑیں رکھتے ہیں، ان کو اکھاڑ پھینکنا ممکن نہیں ہوتا۔ البتہ یہ پوشیدہ ہوتے ہیں اور ان کے تقاضے انسان کے ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص ان پر متنبہ ہو جائے، اس کو ان کی بصیرت حاصل ہو جائے اور وہ ان کی کمین گاہ کو پالے تو اسے ان اصولوں کا یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی نگاہوں میں کھب جاتے ہیں، اس کا فہم ان پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص گہری حکمت کا مالک ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے علم کو بھی پختگی حاصل ہوتی ہے اور اس کی فطرت بھی محکم ہوتی ہے۔ وہ اس درجہ کو اس لیے پالیتا ہے کہ اس نے ان فطری اصولوں کی پہچان کر لی اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ کسی چیز کی معرفت کا اطلاق اس حقیقی علم پر ہوتا ہے جو نفع بخش ہو اور جو آدمی کے فہم اور ارادہ سے ایک حقیقت کے طور پر ابھرا ہو۔

وہ معارف جن کو حکمت کا نام دیا جاتا ہے بہت زیادہ نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت علم کے درخت کے بیج کی سی ہے۔ اس معاملے میں حکمت دوسری ان تمام قوتوں کی مانند ہے جن سے بکثرت علوم و معارف پیدا ہوتے ہیں، مثلاً سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتیں یا ان کا ابتدائی ادراک۔ حکمت تمام بدیہی چیزوں میں سب سے زیادہ واضح ہے اور جو چیز بدیہی ہوتی ہے

اس کی حیثیت جڑ اور تنے کی ہوتی ہے۔ جس طرح آپ جو کچھ دیکھتے ہیں وہ آپ کو روشنی کی بدولت نظر آتا ہے۔ لیکن آپ روشنی کو نہیں دیکھتے بلکہ ان اشیاء کے دیکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں جو روشنی میں دکھائی دے رہی ہوتی ہیں یا جس طرح آپ آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہیں تو خود آئینہ آپ کو نظر نہیں آتا جب تک خاص اہتمام سے اس کی جانب متوجہ نہ ہوں، ٹھیک یہی معاملہ حکمت کے طالب کو بھی پیش آتا ہے۔ اس کا منبع اس کی ذات کے اندر ہوتا ہے، اسے اس کی خاطر چل کر کہیں جانا نہیں پڑتا۔ لہٰذا اس کے لیے صحیح لائحہ عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی طرف رجوع کرے۔ اس کی فطرت اور اس کے عجائب پر غور کرے کیونکہ یہی حکمت وہ نور ہے جس سے وہ اس کے گرد و پیش اور اوپر اور نیچے کو دیکھے گا۔ اسی سبب کی بنا پر اگلوں نے تمام معارف میں نفس کی معرفت کو سب سے اہم اور بنیادی سمجھا۔ وہ شخص کتنا بے خبر ہے جو اپنی ذات کے احوال سے تو غافل رہے لیکن دور کی چیزوں میں مشغول رہے؟ ...

قرآن مجید کی حکمت کے حجابات:

قرآن مجید نے اپنے فضل خاص سے حکمت کی کوئی بات بغیر بیان کیے یا واضح کیے نہیں چھوڑی اس لیے مسلمان حکمت کے متلاشی بنے اور انہوں نے کوئی ایسا گوشہ نہ چھوڑا جہاں اس کے مراقع کا گمان ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ حکمت جس کی قرآن حکیم نے ترغیب دی تھی۔ پردے ہی میں رہی، اگرچہ وہ بالکل سامنے تھی۔ یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے حکمت کے لفظ سے کوئی دوسری چیز مراد لے لی اور پھر اسی پر قناعت کر لی۔ اس کے باوجود وہ اس سے پورے طور پر محروم بھی نہ رہے۔ یہ ایسا ہی ہے جس طرح کمزور بینائی والا آدمی دھوپ کی جانب تو نہیں دیکھ سکتا لیکن اس کی چمک اور روشنی محسوس کر لیتا ہے اور اس طرح وہ روشنی سے بالکل بے خبر نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی تھی جس نے کوئی چیز ورثہ میں پائی لیکن اس کو پہچاننے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ جب اس کی جستجو کرتا ہے تو ہر اس چیز پر ہاتھ رکھ دیتا ہے جس کے بارے میں اس کا گمان ہو کہ یہی وہ چیز ہے جو اس نے ورثہ میں پائی۔ رہا وہ شخص جس نے کسی دوسرے کے پاس حکمت کی صفات پہچان لیں۔ اس کی علامات اس پر واضح ہو گئیں اور اس جیسی چیز خود اس کے اپنے پاس موجود تھی تو اس پر معاملہ مشتبہ نہیں ہو سکتا۔ جب وہ اس پر آگاہ ہوتا ہے تو حکمت کو شناخت کر لیتا ہے کیونکہ اس جیسی حکمت اس کے اپنے پاس موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا

یہ شخص کھوئی ہوئی متاع کو پانے والا ہوتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا کہ "الحکمۃ ضالۃ المومن" (حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے)۔

مسلمانوں نے درج ذیل چند متعین علوم میں دلچسپی لی ہے۔ دیکھیے ان میں سے کس پر حکمت کا اطلاق ہو سکتا ہے:

ا۔ علوم قرآن مثلاً تفسیر و قراءت
ب۔ حدیث مع اصول حدیث و رجال
ج۔ فقہ مع اصول و فروع
د۔ کلام، عقائد و مناظرہ
ہ۔ منطق
و۔ فلسفہ اور اس کی نظری و عملی شاخیں مثلاً طبیعیات، ریاضی، طب و فلکیات۔
ز۔ معیشت کے لیے نفع بخش علوم مثلاً صنعت و حرفت وغیرہ
ح۔ سیاسیات و تہذیب امم
ط۔ اثری علوم، تاریخ و سیرت
ی۔ تصوف

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے صنعت و حرفت سے تعلق رکھنے والوں کے سوا علم کی ہر شاخ سے تعلق رکھنے والا شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کے پاس حکمت کا ایک حصہ ہے۔ ان لوگوں کی اپنے اپنے علم میں مشغولیت ہی ان کے اور حکمت کے درمیان ایک حجاب بن گئی۔

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل سے خطاب کی حکمت

قرآن مجید کا آغاز اگرچہ سورۂ فاتحہ سے ہوتا ہے لیکن اہل تحقیق کے نزدیک اس سورہ کی حیثیت بندے کی زبان سے ایک دعا کی ہے جس کے جواب میں اللہ رب العالمین نے قرآن مجید کی تعلیم فرمائی جس کی پہلی سورہ البقرہ ہے۔ اس سورہ میں قرآن مجید کو ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے متعارف کرانے اور اس کے نزول کی ضرورت بیان کرنے کے بعد اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ دعوت اگرچہ عام ہے لیکن بنظر غائر دیکھنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن مجید نے خاص طور پر یہود کو خطاب کرکے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔ اس کے ذیل میں ان کے ساتھ بحث جو چھیڑی ہے تو تقریباً ایک سو آیات تک یہ بحث ختم ہونے میں نہیں آتی۔ قرآن کے ایک طالب علم کے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ آخر پہلی ہی سورہ میں یہود کو کیوں مخاطب کیا گیا، ان کی تاریخ کے متعدد واقعات کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد کیا ہے، بحیثیت گروہ ان کو کیوں مطعون کیا گیا اور اس ساری بحث کا مدعا کیا ہے؟

یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ قرآن مجید کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہ پہلی آسمانی کتاب ہے۔ بلکہ وہ یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ دین شروع سے ایک ہی رہا ہے اور وہ اسلام ہے، خدا کے پیغمبر ہر دور میں اسی کو پھیلاتے رہے، آسمانی شریعت درجہ بدرجہ مختلف امتوں کے حوالے کی گئی اور جب جب ان امتوں نے اس میں بگاڑ پیدا کیا، خدا نے اس بگاڑ کی اصلاح کا اہتمام فرمایا۔ اس حقیقت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آسمانی کتابیں پہلے بھی نازل ہوتی رہی ہوں اور ان میں ترمیم و تنسیخ بھی ہوتی رہی ہو۔ لہٰذا قرآن مجید آسمانی کتابوں کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ قرآن مجید کے اس دعوے کے نتیجہ میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کو منوانے سے پہلے اپنے نزول کا جواز فراہم کرے اور اس قوم کی نااہلیت کو واضح کرے جس کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ پہلے سے آسمانی ہدایت کی حامل اور بنی نوع انسان کی تعلیم پر مامور ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو

اہل قوم کی حیثیت مرتی قائم رہتی ہے۔ لہٰذا قرآن مجید نے اپنی پہلی ہی سورہ میں یہود کو خدا کی دی ہوئی امانت کے خائن اور بدعہد ثابت کرکے یہ اعلان کیا ہے کہ اب اس قوم سے یہ امانت واپس لے کر دوسری قوم کے حوالے کی جا رہی ہے اور یہود اب اپنے منصب سے معزول قرار دے دیئے گئے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے زمانے سے قریب العہد قوم تو نصاریٰ تھے اس لحاظ سے وہ اس لائق تھے کہ قرآن ان کو مخاطب کرتا اور ان کو ہدایتِ اقوام کے منصب سے معزول کرنے کا اعلان کرتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نصاریٰ اسلام سے قبل آخری مذہب کے حامل تصور کیے جاتے ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ جس آسمانی شریعت کے ماننے والے ہیں وہ وہی ہے جس کے اصل حامل یہود ہیں۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن مجید نے رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (بنی اسرائیل کی طرف رسول) فرمایا ہے یعنی آپ بنی اسرائیل ہی کی طرف بھیجے گئے رسولوں کے سلسلہ کی آخری کڑی تھے۔ موجودہ انجیلیں بھی اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف یہود ہی کی اصلاح سے دلچسپی تھی۔ آپ برملا کہتے تھے کہ مجھے اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف بھیجا گیا ہے (متی ۱۵: ۲۴)۔ آپ نے اپنے حواریوں کو تبلیغ کے مشن پر روانہ کیا تو انہیں خاص طور پر ہدایت کی کہ میری تعلیم اسرائیلیوں کے لیے ہے، اسے غیر اسرائیلی لوگوں کے آگے پیش نہ کرنا (متی ۱۰: ۵، ۶)۔ آپ کی شفا بخشی بھی یہود کے لئے خاص تھی۔ آپ نے ایک اسرائیلی عورت کو تو سبت کے دن بھی شفا دی لیکن ایک کنعانی لڑکی کو شفا دینے سے مسلسل انکار کرتے رہے کیونکہ وہ اسرائیلی نہ تھی۔ پھر اس کی ماں کے بے حد اصرار کے بعد اس کو دعا دینے پر آمادہ ہوئے۔ آپ کی شریعت تورات ہی کی شریعت تھی، آپ نے مختلف مواقع پر اس کے احکام کی روح کو واضح فرمایا لیکن اس کے احکام کو منسوخ یا تبدیل کرنے کی سعی نہیں فرمائی۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اسلام سے پہلے اصل حامل شریعت گروہ یہود ہی کا تھا۔ نصاریٰ انہی کے حاشیہ بردار اور خوشہ چین تھے۔ لہٰذا قرآن مجید نے جب نئی شریعت دینے کا فیصلہ کیا تو سابقہ شریعت کو کالعدم قرار دینے کے لئے پہلے یہود کے جرائم پر سے پردہ اٹھانا ضروری سمجھا اور نصاریٰ کو ان کے تابع رکھا جیسا کہ ان کی واقعی حیثیت تھی۔

یہود کی تاریخ نہایت طویل ہے۔ اس گروہ کی اپنی خصوصیات رہی ہیں اور خود ان کے ان صحیفوں میں جو اس وقت عہد نامہ عتیق کا حصہ ہیں، ان کے کردار کے بُرے پہلوؤں پر انبیاء کی زبان سے نہایت سخت تنقیدیں موجود ہیں۔ یہ گروہ ہمیشہ اس زعم میں مبتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اقوام عالم میں ایک خاص مقام دے رکھا ہے۔ ان کو جو عزت دی گئی وہ ان کے اولادِ اسرائیل ہونے کی بنا پر دی گئی۔ چنانچہ یہ خداوند کی ایک منتخب

قوم ہیں، ان کے ساتھ خداوند نے خود میثاق باندھا ہے۔ لہٰذا ان کے لیے آتشِ دوزخ کا دائمی عذاب نہیں ہے۔ اس زعم میں یہ نہ صرف قدیم زمانے میں مبتلا رہے ہیں بلکہ عقلیت کے اس دور میں بھی ان کے اندر یہی مذہبی شعور موجود ہے۔ یہودیت کا ایک پروفیسر ڈاکٹر ایلن انٹرمن جو خود بھی یہودی ہے، اپنی کتاب "یہود" میں لکھتا ہے :

"روایتی طور پر یہودیت نے اپنے آپ کو ایک مذہب نہیں سمجھا بلکہ اس کی نظر میں یہ ان تعلیمات اور احکام کا مجموعہ ہے جو خداوند اور اسرائیل کے میثاق کے تعلق کا نتیجہ ہیں۔ . . . . موجودہ دور میں روایتی یہودیوں کے اندر یہودیت کو ایک مذہب قرار دینے کے خلاف خاصی مزاحمت پائی جاتی ہے۔ اس کو وہ اپنی حیثیت سے فروتر سمجھتے ہیں۔ وہ یہودیت کو عیسائیت، اسلام یا بدھ مت کی قسم کا مذہب نہیں مانتے، ان کے نزدیک اس کی حیثیت منفرد ہے۔ یہ اپنی طرز کا واحد طرزِ زندگی ہے جس میں اسرائیل کے ساتھ خداوند کے عہد کے ذریعے خدا کی وحی تعلیم ہوتی ہے۔" (صفحہ ۷)

مصنف کے مطابق یہود کے اس نظریے میں ۷۰ء میں یروشلم کی تباہی کے بعد سے اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ دوسرے الفاظ میں چھٹی صدی عیسوی میں قرآن مجید کے نزول کے وقت بھی یہود کے خیالات یہی تھے۔

دورِ حاضر کا ایک مورخ ڈاکٹر رافیل پٹائی اپنی ضخیم کتاب "یہودی ذہن" میں اس بات کی تحقیق کرتے ہوئے کہ یہودی ذہن کے مرکز میں کونسا شعور ہے جو یہودیوں کو غیر یہودیوں سے مختلف کرتا ہے، جہاں دوسری خصوصیات بیان کرتا ہے۔ وہاں خداوند اور اسرائیل کے درمیان ایک خصوصی تعلق پر ایمان کو بھی ایک ایسی خصوصیت قرار دیتا ہے جس نے یہود کو ہر زمانے اور ہر علاقے میں ہمیشہ گرمائے رکھا اور اس کے سبب سے انہوں نے غیر یہودیوں سے ہمیشہ اپنے کو ممتاز سمجھا۔

گویا بائبل کے زمانہ سے لے کر آج کے دور تک یہود اس خوش گمانی میں مبتلا رہے ہیں کہ ان کی حیثیت اقوامِ عالم کے مقابلہ میں بالکل جداگانہ ہے۔ خدا کو اسرائیل کے گھرانے سے خاص محبت ہے کیونکہ اسرائیل عیال اللہ ہیں۔ اس محبت کے باعث خدا نے بنی اسرائیل کو اپنی خدمت کے لئے خاص کر لیا ہے۔ اس نے ان کے ساتھ میثاق باندھا ہے جس کی رو سے وہ ہمیشہ اس کے احکام کے محافظ رہیں گے اور وہ ان کو جہنم میں ہمیشہ کے لئے نہیں ڈالے گا۔ خدا اگرچہ تمام دنیا کا خالق و مالک بھی ہے۔ لیکن چونکہ اس کا میثاق صرف اسرائیل کے گھرانے کے ساتھ ہے۔ اس لیے دوسری کوئی قوم خدا کے ساتھ اس طرح کا تعلق نہیں رکھ سکتی

جو تعلق خدا کا بنی اسرائیل کے ساتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس عقیدے کی رو سے نہ یہود کی شریعت کالعدم ہو سکتی اور نہ کوئی دوسری قوم یہ حق حاصل کر سکتی کہ وہ خدا کی ہدایت کی حامل بن کر ابھرے اور یہود کی جگہ لے۔ قرآن مجید نے جب نئی شریعت دینے کا ارادہ کیا تو پہلے یہود کے اس عقیدے کو باطل کیا۔

سورۂ بقرہ یہود کے اس عقیدے پر ضرب کاری لگاتی ہے اور اس نے اس کے ہر ہر حصے کی قلعی کھولی ہے۔ اس نے یہ واضح کیا ہے کہ یہود کا اقوامِ عالم میں سے انتخاب اسرائیل کے گھرانے سے کسی خاص محبت کی بدولت نہ تھا بلکہ ایمان و عمل صالح کی بدولت تھا اور ہر قوم کے ساتھ جس کو شریعت کی امانت سونپی گئی۔ خدا کا معاملہ اسی بنیاد پر ہوتا رہا ہے، اس میں یہود کو دوسری اقوام پر کوئی خاص ترجیح حاصل نہیں ہے۔ اس سورہ نے میثاق کے تحت یہود کی ذمہ داریاں بتا کر یہ واضح کیا ہے کہ یہود ان کے ادا کرنے میں کس طرح ناکام ہوئے پھر یہود کے اس گمان کی قلعی بھی کھولی ہے کہ خدا ان کو ہمیشہ کے لئے دوزخ میں نہیں ڈالے گا۔

سورۂ بقرہ کی آیات ۴۰ تا ۴۶ میں یہود کو ان کی منصبی ذمہ داریاں یاد دلا کر قرآن مجید پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے کہ یہ ان کے اس عہد کا تقاضا ہے جو انہوں نے خدا سے کر رکھا ہے اور اس کی خبر پہلے سے ان کو دے دی گئی تھی۔ یہود پر اس دعوت کا اثر نہ ہوا۔ اور اس کے اسباب میں ان کی وہی خوش فہمیاں کارفرما تھیں جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ لہٰذا آیات ۴۷ تا ۶۲ میں یہ بیان کیا گیا کہ بلاشبہ اللہ کا بنی اسرائیل پر بڑا انعام ہوا۔ اس نے تمام اقوام پر ان کو فضیلت دی، اس نے ان کو طاقتور دشمن سے اپنے فضل خاص سے نجات دی، حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں انہوں نے بچھڑے کا بُت بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی تو خدا نے اس شرک سے بھی ان کی توبہ کو قبول کر لیا اور ان کو آسمانی شریعت عطا فرمائی، خدا نے ان کو پے در پے نعمتوں سے نوازا تاکہ ان کے اندر شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوں لیکن ان کے اس انتخاب کا یہ مفہوم کبھی نہیں رہا کہ خدا کو ان سے کوئی گروہی محبت تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی کوتاہیوں کو وہ نظر انداز کرتا رہتا لیکن وہ تو برابر ان کی زیادتیوں کی سزا دیتا رہا۔ ان کی نافرمانیوں پر ان پر آسمانی عذاب بھی آیا۔ شرارتوں پر ان سے نعمت زائل بھی ہوئی اور وہ خدا کے غضب کے مستحق قرار دیے گئے۔ خدا جب کسی قوم کا انتخاب کرتا ہے تو وہ اس کے نسب کی بنا پر نہیں کرتا، بلکہ ایمان و عمل صالح کی بنیاد پر کرتا ہے اور تنہا یہود ہی اس بنیاد پر منتخب نہیں ہوئے۔ بلکہ مسلمان، یہود، نصاریٰ، صابی سبھی اپنے اپنے زمانوں میں اس فضیلت کے مستحق قرار پائے اور سب کے لیے معیار یکساں رہا ہے۔ لہٰذا یہود اپنے دماغ سے اقوامِ عالم پر برتری کا کیڑا نکالیں۔

آیات ۶۳ تا ۹۰ میں یہود کے اس دعوئ کو رد کیا گیا ہے کہ خدا کا ان کے ساتھ ایک ایسا عہد ہو چکا ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہنے والا ہے۔ ان آیات میں یہ واضح کیا ہے کہ خدا نے شریعت کی پابندی کا بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ لیکن اپنی تاریخ میں انہوں نے اس عہد کو پامال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور چونکہ کوئی معاہدہ یک طرفہ طور پر نافذ نہیں ہوتا اس لئے خدا نے عہد کی خلاف ورزی پر یہود کی سزا دی۔ سبت کی پابندیوں کو توڑنے والی بستی عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئی۔ میثاق پر عمل کرنے میں یہود کس طرح لیت ولعل سے کام لیتے رہے اس کی وضاحت کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس حکم کا حوالہ دیا ہے جس میں انہوں نے یہود کو ایک گائے ذبح کرنے کو کہا تاکہ وہ اس پر قاتل کا سراغ لگانے کے لیے لوگوں سے حلف لے سکیں۔ ایک سادہ حکم پر فوراً عمل کرنے کے بجائے اسرائیلیوں نے سوالات کر کے اس کو ایک چیستان بنا ڈالا۔ اس طرح کے رویہ نے شریعت کے معاملہ میں یہود کے دل سخت کر دیئے اور یہ واضح احکام میں اپنی مرضی کی تحریف کے مرتکب ہوئے۔ انہوں نے اپنے لیے دل پسند مستقبل کے خواب دیکھے اور ایسے ایسے عقیدے گھڑ لیے جن کا خدائی ہدایت سے کوئی دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ اسی ضمن میں ان کا یہ عقیدہ بھی آتا ہے کہ دوزخ کی آگ ان کو بس چند روز کے لئے چھو سکتی ہے ہمیشہ کے لیے نہیں۔ قرآن نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر یہ عقیدہ خدا کے عہد میں لکھا ہوا ہے تو یہود اس کو پیش کریں۔ خدا کی معروف سنت یہ ہے کہ گناہ میں گھر جانے والے شخص کے لئے ہمیشہ کی دوزخ ہوگی جبکہ ایمان و عمل صالح کے ساتھ آدمی ہمیشہ کی جنت میں داخل ہو سکے گا۔ ان آیات میں یہ بھی بتایا ہے کہ یہود نے حقوق اللہ و حقوق العباد میں سے ہر میثاق کو توڑا اور عہد کی خلاف ورزی ان کی عادت ثانیہ بن گئی۔ یہ اپنی مرضی کی توجیہات کر کے عہد کو توڑتے۔ قرآن نے اس کی مثال میں یہ بتایا ہے کہ اپنے ہی بھائی بندوں پر چڑھائی کر کے ان کی تذلیل کرتے اور پھر خود ہی فدیہ دے کر چھوڑ دیتے تاکہ نیکی کا بھرم قائم رہے۔ خدا نے ان کو عہد کی یاد دہانی کے لیے پے در پے نبی بھیجے اور بالآخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا لیکن بنی اسرائیل نے برابر تکبر سے کام لیا اور رسولوں کے قتل سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اسی عادت کا مظاہرہ وہ قرآن مجید کے مقابل میں کرنا چاہتے ہیں۔

آیت ۹۱ سے آگے قرآن مجید نے یہود کے ان وسوسوں کا جائزہ لیا ہے جو وہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے صاحب ایمان اور حامل کتاب گروہ ہونے کی حیثیت کے بارے میں ڈال رہے تھے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کا صاحب ایمان ہونے کا دعویٰ معتبر ہے، نہ حامل کتاب ہونے کا دعویٰ یہ کتاب الٰہی پر سحر و ساحری کو فوقیت دینے والے لوگ ہیں۔ ان کو کتاب دے کر خدا نے اپنے ہاتھ باندھ نہیں لیے ہیں کہ اب وہ کوئی

نئی کتاب کسی کو نہ دے گا۔ اہل کتاب کے لئے نجات کے خاص ہونے کا عقیدہ ان کا خود ساختہ ہے اور اس کا پروپیگنڈہ یہ صرف لوگوں کو اسلام کی راہ سے روکنے کے لیے کر رہے ہیں۔ اس گروہ کے گناہ بہت بڑے ہیں۔ انہوں نے کجروی کے باعث عبادت گاہوں کی حرمت کو بھی محفوظ نہیں رہنے دیا اور توحید کی تعلیم میں بھی انہوں نے بعض شرک کی آمیزش کر دی۔ لہٰذا یہ کسی طور پر اپنے منصب پر قائم رہنے کے حقدار نہیں ہیں۔ آیت ۱۲۲ میں بنی اسرائیل کو پھر سے خطاب کر کے ان کی ذمہ داریاں آخری مرتبہ یاد دلائی ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کیے گئے عہد کی بنیاد بھی کردار پر رکھی گئی تھی اور یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ عہد اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والی بد عہد اولاد کے لیے نہ ہوگا۔ اولاد ابراہیم میں حضرت اسمٰعیل حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور ان کے بیٹوں میں جس عہد کا چرچا رہا وہ یہودیت و نصرانیت نہیں بلکہ توحید خالص پر کاربند رہنے کا عہد تھا۔ لہٰذا اب یہود و نصاریٰ کی خواہشات کے علی الرغم امت مسلمہ اسی قدیمی ابراہیمی مسلک پر مبعوث کی جا رہی ہے اور اہل کتاب کے تمام دعوؤں کو کالعدم کیا جاتا ہے۔

سورۂ بقرہ کے زیر نظر حصے کے مضامین کا یہ تجزیہ واضح کرتا ہے کہ اس میں بنی اسرائیل کو مخاطب کرنے میں گہری حکمت ہے۔ جو بحث اٹھائی گئی ہے اس کے قرآن مجید کے آغاز ہی میں اٹھانے کی ضرورت تھی اور اس بحث میں جن پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے ان سے نہ صرف یہود کا دعویٰ کالعدم ہوا ہے بلکہ ان سے وہ سنت اللہ بھی سامنے آئی ہے جو منصب ہدایت پر سرفراز ہونے والی قوم کے بارے میں ہے اس کی روشنی میں امت مسلمہ اپنا محاسبہ کر سکتی اور یہود کے سے انجام سے بچ سکتی ہے۔

اهم اعلان

مولانا امین احسن اصلاحی کی درج ذیل معرکۃ الآراء تصانیف کے مکمل نظر ثانی شدہ جدید ایڈیشن الحمد للہ شائع ہو گئے ہیں:

۱۔ دعوت دین اور اس کا طریق کار ۳۳/- روپے ۲۔ حقیقت نماز ۱۸/- روپے
۳۔ حقیقت تقویٰ ۱۸/- روپے ۴۔ قرآن میں پردے کے احکام ۴/- روپے
۵۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام ۳۶/- روپے

علاوہ ازیں ان کی مندرجہ ذیل کتب بھی تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں جو ان شاء اللہ جلد دستیاب ہوں گی:

۱۔ مبادئ تدبر قرآن ۲۔ تزکیۂ نفس۔ جلد دوم ۳۔ مبادئ تدبر حدیث ۴۔ حقیقت شرک و توحید
۵۔ اسلامی قانون کی تدوین ۶۔ اسلامی ریاست ۷۔ مجموعہ تفاسیر فراہی ۸۔ مقالات اصلاحی

ناشر: **فاران فاؤنڈیشن** ۱۲۲ فیروز پور روڈ۔ لاہور۔ ۵۴۶۰۰
فون: ۲۷۳۴۷۷

ظلم کی حقیقت

انسان کی اخلاقی بیماریوں میں سے ایک انتہائی مہلک بیماری ظلم ہے۔ انسان کی تاریخ دراصل ظلم و حق تلفی کی داستان ہے۔ ہمیں قدم قدم پر ایسے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو دوسرے کے حقوق غصب کرکے نہ صرف خوش ہوتے ہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں یہ لوگ اپنے معمولی سے فائدہ کی خاطر لالچ میں اندھے ہو کر دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم کرنے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرتے اور ہر قسم کا تشدد روا رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا ظالموں اور مظلوموں سے بھری ہوئی ہے۔ اس لیے اس مہلک بیماری کی اصل حقیقت اس کے اسباب اور ظالموں کے انجام پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ظلم عدل و حق کی ضد ہے۔ اس کے معنی حق تلفی کے ہیں اور عام طور پر یہ لفظ اردو زبان میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے لیکن قرآن مجید کی اصطلاح میں ظلم کا لفظ بڑے وسیع معانی کا حامل ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کا بے جا استعمال اور ان انعامات کو خدا کا فضل قرار دینے کی بجائے اپنا حق سمجھنا اور پھر غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر ابلیس کی طرح اکڑنا ہے۔ خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کی روش اختیار کرنے کی بجائے خود اپنی خدائی کا تخت بچھانا اور اپنے آپ کو رب ٹھہرانا بھی ظلم ہے۔ جو لوگ اس ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں، ان پر ہدایت کی راہ نہیں کھلا کرتی۔ ایسے لوگوں کے سامنے حق کتنے ہی واضح طریقے پر آئے وہ اس کو قبول کرنے کی بجائے بحث اور کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے ہیں یہاں تک کہ اگر ان کو اس کی راہ ملتی نظر نہیں آتی تو وہ نمرود کی طرح ہکا بکا اور ششدر ہو کر تو رہ جاتے ہیں لیکن حق کو پھر بھی قبول نہیں کرتے۔

ظلم عظیم:

ظلم کی اصل حقیقت جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے حق تلفی کرنا ہے۔ انسان پر سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے کیونکہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے وہی اس کا خالق ہے، اس نے انسانوں کو پیدا کیا اور ربوبیت کے تمام سامان کا اہتمام کیا۔ انسان کے لیے انواع و اقسام کی نعمتوں کا انتظام کیا۔ اس کو مختلف صلاحیتوں اور قابلیتوں سے نوازا۔ عقل ایسی نعمت عطا کی جس نے اس کو اشرف المخلوقات بنا دیا۔ اس لیے خدا کا حق یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے اور اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اس کی خدائی میں کسی کو شریک کرنا سب سے بڑا ظلم یا حق تلفی ہے۔ چنانچہ سرزمین عرب کے ایک بڑے حکیم حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو مرتے وقت جو نصیحت کی اس میں سب سے پہلی حقیقت یہ بیان کی کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم ہے)۔ شرک کے ظلم عظیم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جن چیزوں کو خدا کا شریک و شفیع بنا لیا جاتا ہے ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ نہ خدا نے ان کے حق میں کوئی پروانہ جاری کیا ہے کہ وہ اس کی خدائی میں شریک ہیں اور نہ لوگوں کے پاس ان کے باب میں کوئی علم ہے یا دلیل۔ خدا کے اذن کے بدون کسی کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ خدا نے اس کو اپنا شریک بنایا ہے اللہ پر ایک بہت بڑا بہتان ہے۔ اور جس چیز کے بارے میں کوئی عقلی و فطری دلیل نہ ہو اس کو معبود بنانا محض ظن کی پیروی ہے اور ظن علم و حق کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے سورہ حج میں فرمایا۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ	اور یہ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور نہ ہی ان کے بارے میں ان کو کوئی علم ہی ہے اور ان ظالموں کا کوئی مددگار بننے والا نہیں ہے۔
سورۂ حج	

جان پر ظلم:

قرآن مجید کی رو سے انسان کے اپنی جان پر ظلم ڈھانے کی کئی ایک شکلیں ہیں اور اس نے ظالم کے لفظ سے ان لوگوں کو مراد لیا ہے جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

مخلوق کی پرستش : اللہ تعالےٰ نے انسان کو تمام مخلوقات سے اشرف اور اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اسی کے اندر انسان کی تمام عظمت و قوت کا راز مضمر ہے۔ انسان جب اپنے سے فروتر اور گھٹیا مخلوق کو اپنا رازق اور حاکم مان کر اس کی پرستش کرنے لگتا ہے تو وہ اپنے نفس کی سخت تحقیر کرتا ہے۔ گویا وہ شاہین ہوتے ہوئے کنجشکِ فرومایہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن میں جگہ جگہ ان لوگوں کو ظالم قرار دیا گیا ہے جو حقیر اشیا کو معبود بنا کر پوجتے، ان کے آگے سجدہ ریز ہوتے اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

رسولوں کی تکذیب :

رسولوں کی تکذیب کر کے بھی انسان اپنے اوپر ظلم ڈھاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو جن اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا وہ ان کی قدر کرنے کی بجائے ان کو برباد کرتا ہے اور جب اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالےٰ نے رسول بھیجے تو بجائے اس کے کہ وہ ان پر ایمان لاتا اس نے رسولوں کی نافرمانی کر کے خود اپنی تباہی کے اسباب فراہم کیے۔ جو قومیں رسولوں کی تکذیب کرتی ہیں ان کو یہ سزا دی جاتی ہے کہ ان کو صفحہ ہستی سے مٹا کر ان کی جگہ دوسری قوموں کو دے دی جاتی ہے لہٰذا رسولوں کے مکذبین ہمیشہ تباہی سے دوچار ہو کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ سورہ یونس میں ارشاد ہوتا ہے :

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝
(سورۃ یونس ۱۳)

اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جبکہ وہ ظلم کی مرتکب ہوئیں اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں مجرم قوموں کو۔

یعنی یہ کہ پچھلی قومیں ہلاک ہوئیں تو اپنی ضد اور سرکشی کے سبب سے ہلاک ہوئیں خدا نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا اس لیے کہ ان کو پہلے سے تمام نتائج و عواقب سے

اس نے آگاہ کر دیا تھا بلکہ انہوں نے تو اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے کہ تنبیہ و تذکیر سے فائدہ اٹھانے کی بجائے عذاب کا مطالبہ کیا اور اپنے رسولوں کی تنبیہات کا مذاق اُڑاتے رہے۔

کتاب کی تکذیب :

رسول اور کتاب الٰہی ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں لہٰذا رسول کے مکذبین کے لیے کتاب اللہ کی تکذیب کرنا نہ صرف بہت آسان ہو جاتا ہے بلکہ یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ وہ رسول کی تو تکذیب کریں اور کتاب اللہ کو مانیں۔ یہ لوگ ایسے محروم القسمت اور بدبخت ہوتے ہیں کہ وہ ایسی کتاب کو جھٹلا دیتے ہیں جو ان کے تمام عذرات کا خاتمہ کر دیتی ہے، جو ان کے لیے رحمت و برہان بن کر آتی ہے، جو دنیا میں ان کی رہنمائی کے لیے روشنی کا مینار اور آخرت میں رحمت الٰہی کے حصول کی ضامن ہوتی ہے۔ ایسی کتاب کو جھٹلانے کے صاف معانی یہ ہیں کہ یہ شامت زدہ لوگ ہیں اور خود اپنی تباہی کو دعوت دے رہے ہیں۔

سورہ انعام کی حسب ذیل آیت ایسے ہی لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَاۗءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۭ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْۗءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۔
(انعام - ۱۵۷)

یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ سو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح حجت اور ہدایت و رحمت آ گئی تو اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائے اور ان سے دوسروں کو پھیرے؟ جو لوگ ہماری آیات سے اعراض کر رہے ہیں ہم ان کو اس اعراض کی پاداش میں عنقریب نہایت بُرا عذاب دیں گے۔

معلوم ہوا کہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے لوگ نہ صرف یہ کہ خود کتاب کی تکذیب کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی پیدا کرتے ہیں۔

اسلام کے دشمنوں سے دوستی:

اسلام اور اہل ایمان کے مقابل میں ایمان اور اسلام کے دشمنوں کو اپنا دوست و معتمد بنانا بھی خود اپنی جان پر ظلم ڈھانا ہے کیونکہ ان لوگوں نے سواءالسبیل کا راستہ چلنے والے قائد کا ساتھ چھوڑ دیا اور ایسے لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئے جو گمراہی اور ضلالت کی پگڈنڈیوں پر چل رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کا حق اور مفاد دوسرے تمام حقوق و مفادات پر مقدم ہے اس لیے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے برعکس کفار یا ان کی کسی جماعت کے ساتھ موالات کا تعلق قائم کرے۔ خدا اور اس کے دشمنوں کے ساتھ بیک وقت دوستی قائم نہیں رکھی جا سکتی۔ اللہ سے دوستی کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں سے اپنا دامن بچا کے رکھا جائے جو اللہ کے اس کے دین کے اور اس کے وفادار بندوں کے دشمن ہیں۔

سورۃ مائدہ میں واضح طور پر اس طرف اشارہ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا	اے ایمان والو تم یہود و نصاریٰ کو
الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ	کو اپنا دوست نہ بناؤ وہ آپس میں
بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَ	ایک دوسرے کے دوست ہیں۔
مَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ	اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست
مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي	بنائے گا تو وہ ان میں سے ہے۔
الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (مائدہ ۵۱)	اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

قانونِ الٰہی سے صرفِ نظر:

اللہ کی کتاب اور اس پر عمل کی آزادی رکھتے ہوئے اس کے قانون کو نظر انداز کرنا اور رسول کی عدالت کو چھوڑ کر اپنے معاملات کو فیصلہ کے لیے طاغوت کی عدالت میں لے جانا نہ صرف خدا اور اس کے رسول کا سب سے بڑا حق تلف کرنا ہے بلکہ خود اپنے نفس اور خدا کے دوسرے بندوں کا بھی بہت بڑا حق تلف کرنا ہے کیونکہ خدا کی عدالت کے سوا کسی اور عدالت میں معاملات کو لے جانے کا مطلب خدا کی حاکمیت کا انکار اور بالواسطہ شرک اور کفر کا ارتکاب

ہے لہٰذا قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو ظالم قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہود کی مثال بڑی واضح ہے جن کی عدالتیں قیام عدل و انصاف کے نقطۂ نظر سے بالکل بے جان اور بے خوف ہو چکی تھیں۔ اوّل تو یہود نے خود قانون ہی کو اپنے اغراض کے تحت مسخ کر کے بالکل بے اثر کر دیا تھا دوسرے جھوٹ اور رشوت کا ان کے یہاں اتنا زور تھا کہ کسی معاملہ میں نہ گواہوں کی گواہی کا کوئی وزن باقی رہ گیا تھا نہ عدالتوں کے انصاف کا۔ بڑی آسانی سے گواہوں اور حکام دونوں کو رشوت کے ذریعہ سے خریدا اور ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اقتدار کی یہ دو عملی اور یہودی عدالتوں کی انصاف فروشی ان لوگوں کے لیے ایک چور دروازہ فراہم کرتی تھی جو قانون کے تقاضوں سے فرار اختیار کرنا چاہتے۔ چنانچہ منافقین اور یہود اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ شرارت کرتے کہ جن معاملات میں ان کو توقع ہوتی کہ آنحضرتؐ کی عدالت سے فیصلہ ان کے حسب منشا ہو جائے گا ان کے لیے آنحضرت صلعم سے رجوع کرتے لیکن جن میں اپنے حسب منشا فیصلہ ہونے کی توقع نہ ہوتی ان کے لیے یہودی عدالتوں سے رجوع کرتے تاکہ جھوٹے گواہوں اور رشوت کے ذریعے اپنے حسب منشا فیصلے حاصل کر سکیں۔ قرآن نے ان کی اس روش پر افسوس کیا ہے اور ایسے لوگوں کو ظالم قرار دیا ہے کیونکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا ایمان کسی بھی چیز پر نہیں ہے وہ صرف اپنی خواہشوں کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا سورۃ مائدہ میں فرمایا:۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ	اور جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ	مطابق فیصلے نہیں کریں گے تو وہی
(مائدہ ۴۵)	لوگ ہیں جو ظالم ٹھہریں گے۔

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان شریعت کے احکام کو پس پشت ڈال دے اور اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کو پھلانگنے کی جسارت کرے۔ اس طرح خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کیونکہ اللہ نے جو قیدیں اور پابندیاں بندوں پر عائد کی ہیں اپنے کسی نفع کے لیے نہیں عائد کیں بلکہ بندوں کی بہبود کے لیے عائد کی ہیں۔ جو لوگ ان کو توڑتے ہیں وہ ان کو توڑ کر اپنے ہی شخصی، نوعی، عائلی اور اجتماعی مصالح برباد کرتے ہیں لہٰذا یہ حرکت بھی اپنی جان پر ظلم کرنا ہے۔

اس حقیقت کی طرف سورۃ طلاق میں اشارہ کیا ہے وہاں طلاق کے ضمن میں حدود مقرر کی ہیں اس کے بعد فرمایا ہے۔

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ
فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۔
(الطلاق - ۱)

اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کریں
گے تو انہوں نے اپنی ہی جانوں پر
ظلم ڈھایا۔

اپنی شرائط پر نیکی :

اپنی جان پر ظلم کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ آدمی نیکی کا کوئی کام سرانجام تو دے لیکن اپنے ذاتی مقاصد کی خاطر اس کی ان شرائط کو ملحوظ نہ رکھے جو شریعت نے عائد کی ہیں اور قرآن مجید نے جن کی تعلیم دی ہے مثال کے طور پر دولت دنیا کو معبود بنانے والے لوگ خدا کی راہ میں سرے سے خرچ ہی نہیں کرتے یا خرچ کرتے ہیں تو ریا، احسان داری اور دل آزاری سے اس کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ان لوگوں کا سارا اعتماد، انفاق وایثار اور خدا کے فضل ورحمت کے بجائے اپنے مال پر ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے ایسے لوگوں کو بھی ظالم کہا ہے اور بتایا ہے کہ خدا کے ہاں ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ
اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ
اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ اَنْصَارٍ ۝
(بقرہ -- ۲۷۰)

اور جو کچھ بھی تم خرچ کروگے یا جو
کچھ بھی نذر مانوگے تو یاد رکھو کہ اللہ اس
سے اچھی طرح واقف ہے اور ان لوگوں
کا کوئی مددگار نہ ہوگا جو اپنی جانوں پر ظلم
ڈھانے والے ہیں۔

خدا اور رسول کے بعد انسانوں میں سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالےٰ ان ہی کو آدمی کے وجود میں لانے اور پرورش کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس لیے تمام آسمانی شرائع نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی ہے۔ والدین کے حقوق کے بعد قرابت مندوں کے حقوق ہیں جو دراصل اسی حق سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر یتامیٰ، مساکین اور پڑوسی وغیرہ کے حقوق ہیں۔ ان میں سے کسی کے حقوق کو نظر انداز کرنا حقوق العباد پر ظلم ہے جس کا وبال اس شخص پر ہوگا جو یہ حق تلفی کرتا ہے۔

ظلم کا انجام :

اعمال کی جزا کے باب میں سنت الٰہی یہ ہے کہ قوموں کے اجتماعی گناہوں کا فیصلہ اس دنیا میں کردیا جاتا ہے جبکہ افراد کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ لہٰذا جن قوموں کی طرف رسول مبعوث ہوتے لیکن انہوں نے رسولوں کی تکذیب کردی ان کو اللہ تعالےٰ نے ان کی ضد اور سرکشی کی دنیا ہی میں سزا دے دی۔ ان کو پہلے ہی سے تکذیب رسول کے تمام نتائج د عواقب سے آگاہ کردیا گیا تھا۔ رسولوں نے ان پر حق پوری طرح واضح کردیا تھا لیکن انہوں نے رسولوں کی تنبیہات کا مذاق اڑایا اور تنبیہہ و تذکیر سے فائدہ اٹھانے کی بجائے عذاب کا مطالبہ کیا اس لیے جب ان پر حجت تمام کردی گئی اور انہوں نے اپنی گمراہی کی روش ترک نہ کی تو اللہ تعالےٰ نے ان قوموں کو ان کے ظلم کی پاداش میں تباہ کردیا۔

سورۂ کہف میں اسی طرف اشارہ ہے۔

وَتِلْكَ الْقُرٰى اَهْلَكْنٰهُمْ
لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا
لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۝
(کہف ۵۹)

اور یہ بستیاں ہیں جن کو ہم نے
ہلاک کردیا جبکہ ان لوگوں نے اپنی
جانوں پر ظلم ڈھاتے اور ہم نے ان
کی ہلاکت کے لیے ایک وقت مقرر کیا۔

ظلم سے مراد یہاں رسولوں کی تکذیب ہے۔

قوم لوط کے ضمن میں واضح طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان کے ہلاک کیے جانے کا فیصلہ خود ان کے اس ظلم کے نتیجہ میں ہوا جو انہوں نے اپنے اوپر کیا کہ فطرت کی راہ سے کھلم کھلا انحراف اختیار کیا۔ خدا کے رسول نے جب اس کے نتائج سے ان کو آگاہ کیا تو ان کی بات پر کان دھرنے کی بجائے وہ اپنی روش میں اور زیادہ بغاوت پر اتر آئے اور پیغمبر کو زچ کرنے کے لیے اس سے عذاب کا مطالبہ کرنے لگے۔

سورۂ عنکبوت میں فرمایا

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ
اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْٓا
اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ

اور جب ہمارے فرستادے
ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے
تو انہوں نے کہا کہ ہم اس بستی کو

الْقَرْيَةِ ۚ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا
ظَالِمِينَ ۝ (عنکبوت ۳۱)

ہلاک کر دینے والے ہیں۔ اس کے
باشندے بڑے ہی ناہنجار ہیں۔

جہاں تک افراد کا تعلق ہے تو اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اور اس کی بخشی ہوئی روشنی کی ناقدری کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے عقل کی رہنمائی اور آفاق و انفس کی گواہی کے ساتھ ساتھ اپنے نبیوں اور رسولوں کی شہادت کے ذریعے بھی حق کو بالکل آشکارا کر دیا ہے۔ اب جو لوگ ان ساری چیزوں کو ہدایت کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو اپنی ضلالت کا ذریعہ بنانے کی کوشش کریں۔ ایسے لوگ اپنی فطرت، اپنی عقل اور اپنی روح پر بہت بڑا ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہدایت کی راہ پر لا کھڑا کرنا اللہ تعالےٰ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا جو خود اپنے ہاتھوں سے نشان راہ گم کر دیں اس طرح کے لوگوں کو وہ بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

سورۃ الاحقاف میں اس کا یوں ذکر کیا گیا ہے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ
عِنْدِ اللَّهِ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ
وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي
إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ مِثْلِهٖ فَآمَنَ
وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ
(الاحقاف ۱۰)

ان سے پوچھو کہ اس وقت کیا ہو گا اگر یہ قرآن اللہ کی جانب سے نازل ہوا اور تم نے اس کا انکار کیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک شاہد نے اس کی مانند کتاب کی گواہی بھی دی ہے۔ سو وہ تو اس پر ایمان لایا اور تم نے تکبر کیا۔ بے شک اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

ایسے لوگوں کا انجام کار کی کامیابی میں کوئی حصہ نہیں ہے کیونکہ یہ کافر، مشرک، حق تلف اور ناسپاس ہوں گے۔ یہ بات اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ کائنات اپنے وجود سے شہادت دیتی ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیم و علیم اور عادل و رحیم کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ قیامت کے دن ان لوگوں کو بخشے جو ظلم اور شرک کے مرتکب ہوں؟

اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا قیامت کے دن کوئی عذر مسموع نہیں ہوگا۔ جو لوگ اپنی گمراہی کا ذمہ دار اپنے لیڈروں کو بنانا چاہیں گے تو ان کے لیڈر خود ان کے اوپر بات پھینک ماریں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے کہ یہ جانتے ہوئے کہ ہم ضلالت پر ہیں تم نے ہماری پیروی کی تو اب ہم اور تم دونوں یکساں ہیں اور دونوں ہی کو اپنے اعمال کی سزا بھگتنا ہے۔ سورۃ مومن میں اس کو یوں بیان کیا ہے۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ
مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ
وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۝
(مومن ۵۲)

جس دن اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کو ان کی معذرت کچھ نفع نہیں دے گی اور ان پر لعنت ہو گی اور ان کے لیے بُرا ٹھکانہ ہوگا۔

یعنی ایسے لوگ قیامت کے دن اللہ کی رحمت سے محروم ہوں گے اس دن ان کے مزعومہ اولیاء ان کے کام آنے والے نہیں ہوں گے اور نہ ہی ان کی کوئی جمعیت و جماعت ہو گی جو ان کی مدد کر سکے۔ یہ لوگ خدا کی رحمت سے اس لیے محروم ہوں گے کہ عدل کا تقاضا یہی ہوگا۔

ایسے لوگوں کا قیامت کے دن یہ حال ہوگا کہ اگر زمین کی ساری دولت بھی ہاتھ آ جائے اور اس کو فدیہ میں دے کر اس دن کی ہولناکی سے نجات پانا ممکن ہو تو وہ اس کو فدیہ میں دے کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ جیسا کہ سورۃ یونس میں اشارہ کیا گیا۔

وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ
مَا فِي الْأَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ
وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا
رَأَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ
بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ
لَا يُظْلَمُونَ ۝
(یونس ۵۴)

اور ہر جان جس نے ظلم کا ارتکاب کیا اگر اس کو مل جاتے وہ سب کچھ جو زمین میں ہے تو وہ اس کو فدیہ میں دے دینا چاہے گی اور وہ پشیمان ہوں گے جب عذاب کو دیکھیں گے اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اور ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

ظالم لوگ جب قیامت کے دن خدا کے عذاب کی پکڑ میں آ جائیں گے تو پھر

اس عذاب میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ عارضی طور پر ہی ان کو اس سے مہلت نصیب ہوگی۔ پھر وہ عذاب سخت سے سخت تر ہوتا جائے گا اور اس کے تسلسل میں کوئی انقطاع نہیں ہوگا۔ سورۂ نحل میں فرمایا:۔

وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝	اور جب وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا ہوگا عذاب دیکھ لیں گے تو پھر نہ وہ ان سے ہلکا ہی کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت ہی دی جائیگی۔
(النحل - ۸۵)	

انسان اگر ظلم کی راہ اختیار کرنے کی آزادی رکھنے کے باوجود محض اپنے رب کی رضا کی خاطر عدل کی راہ پر استوار رہتا ہے اور اپنے سفلی جذبات کے اتباع کی آزادی کے باوجود محض اپنے رب کے خوف سے اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے تو اس کا مرتبہ فرشتوں سے بھی اونچا ہے۔ کیونکہ فرشتوں کو خدا کی بندگی کی راہ میں کسی کشمکش سے دوچار ہی نہیں ہونا پڑتا۔ ان کا راستہ بالکل ہموار اور ان کا مزاج ظلم و جہل کے دواعی سے بالکل ناآشنا ہے لیکن اگر انسان بندگی کرتا ہے تو ہر قدم پر وہ اپنے نفس اور شیطان سے لڑ کر کرتا ہے اس وجہ سے اس کی بندگی فرشتوں کی بندگی سے بھی اونچی ہے۔

خلاصۂ بحث:

خدا اور اس کے رسول، والدین، قرابت مندوں، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں اور معاشرہ کے حقوق غصب اور تلف کرنا ظلم ہے۔ سب سے بڑا ظلم خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا اور رسول اور کتاب کی تکذیب کرنا ہے۔ ایسے لوگ اپنی فطرت، اپنی عقل اور اپنی روح پر بہت بڑا ظلم ڈھاتے ہیں۔ ان کے دل گواہی دیتے ہیں کہ رسول حق پر ہے لیکن پھر بھی ان کی زبانیں اس کو جھٹلاتی ہیں۔ سنت الٰہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بامراد نہیں کرتا جو اپنے ہاتھوں سے نشاناتِ راہ مٹادیں اور آنکھیں رکھتے ہوئے گڑھے میں گر جائیں۔ ایسے لوگوں کی سزا یہی ہے کہ ان پر اللہ اور اس کے فرشتوں اور ساری خلقت کی لعنت ہو۔

تالیفاتِ امام حمید الدین فراہیؒ

	روپے پیسے
۱۔ مجموعہ تفاسیر فراہی	۰۰-۰۰
۲۔ اقسام القرآن	۵-۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے	۵-۰۰

تالیفاتِ مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبرِ قرآن : (مکمل سیٹ : ۹ جلد)	۹۰۰-۰۰
: فی جلد	۱۰۰-۰۰
۲۔ مبادیٔ تدبرِ قرآن	۰۰-۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین	۰۰-۰۰
۴۔ اسلامی ریاست	۰۰-۰۰
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	۱۶-۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام	۴-۰۰
۷۔ تنقیدات	۱۸-۰۰
۸۔ توضیحات	۲۱-۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس : جلد اول	۴۵-۰۰
: جلد دوم	۰۰-۰۰
۱۰۔ مبادیٔ تدبرِ حدیث	۰۰-۰۰
۱۱۔ دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار	۳۰-۰۰
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	۳۶-۰۰
۱۳۔ حقیقتِ شرک و توحید	۰۰-۰۰
۱۴۔ حقیقتِ نماز	۱۸-۰۰
۱۵۔ حقیقتِ تقویٰ	۱۸-۰۰

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲- فیروزپور روڈ، اچھرہ، لاہور — ۵۴۶۰۶ — پاکستان - فون : ۷۷۴۳۷۲